بسم اللہ الرحمن الرحیم

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد:۲۶ ○ شمارہ:۱۱ ○ نومبر ۲۰۱۵ء

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان صفدرؒ

شیخ التفسیر حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید سواتیؒ

رئیس التحریر
ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر
محمد عمار خان ناصر

مجلس تحریر
پروفیسر غلام رسول عدیم
میاں انعام الرحمٰن
ڈاکٹر محمد اکرم ورک
محمد یوسف ایڈووکیٹ
شبیر احمد خان میواتی

انتظامیہ
ناصر الدین خان عامر
عبد الرزاق خان
حافظ محمد طاہر

○

کلمہ حق

عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی صحیح ترجمانی	رئیس التحریر	۲

حالات وواقعات

سود کا خاتمہ: ریاست کی ذمہ داری	حافظ عاکف سعید	۷
اردو پر کرم یا ستم؟ (سپریم کورٹ کے فیصلے پر تبصرہ)	محمد یوسف ایڈووکیٹ	۹
اک چراغ اور بجھا: مولانا سید نظام الدینؒ	مولانا عبد المتین منیری	۱۶
بہار کا عالم	محمد سلیمان کھوکھر	۱۹

آرا وافکار

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر۔۱۱	ڈاکٹر محی الدین غازی	۲۱
موجودہ دور کے فکری چیلنجز اور فضلا کی ذمہ داری	محمد سمیع اللہ سعدی	۲۵
حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ کا منہج واسلوب	غازی عبد الرحمٰن قاسمی	۳۲

مباحثہ ومکالمہ

''مقالات ایوبی'' پر ایک نظر	مولانا عبد الغنی مجددی	۴۷
مکاتیب	محمد یاسر اعوان	۵۵

○

زر تعاون	خط کتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 300 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعہ اکادمی	مکتبہ امام اہل سنت
بیرون ملک سے	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
25 امریکی ڈالر	aknasir2003@yahoo.com	www.alsharia.org	0306-6426001

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد ۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

کلمہ حق

عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کی ضرورت

اقوام متحدہ میں پاکستان کی مستقل مندوب ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے گزشتہ روز جنرل اسمبلی کی لیگل کمیٹی کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''اسلام کی غلط اور غیر معقول عکاسی کرنے والوں کے خلاف کاروائی اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے حکمت عملی بنائی جائے۔ اسلام کے خلاف متعصّبانہ رویہ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تناظر میں اسلامی عقائد کی تعصب پر مبنی کردار کشی کی روک تھام پر بھرپور توجہ دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز تقاریر اور اشتعال انگیز کاروائیاں ناقابل برداشت ہیں جو کہ نہ صرف رویوں میں شدت کا باعث بنتی ہیں بلکہ اس سے مغرب اور اسلامی دنیا کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح دہشت گردی کی ان بنیادی وجوہ کو دور کرنا ضروری ہے جن سے دہشت گردی فروغ پاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بین الاقوامی برادری کو دہشت گردی کی بنیادی وجوہ سمیت طویل عرصہ سے حل طلب تنازعات کے حل، طاقت کے غیر قانونی استعمال اور جارحیت کی روک تھام جیسے امور پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے کہا کہ بین الاقوامی برادری کو غیر ملکی قبضہ، حق خودارادیت سے انکار، سیاسی اور اقتصادی ناانصافیوں کے ساتھ سیاسی استحصال اور پسماندگی جیسے مسائل حل کرنے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

اقوام متحدہ کے کسی فورم پر اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے اس قسم کی باتیں ایک عرصہ کے بعد سنائی دی ہیں جن پر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ ایک دور میں ڈاکٹر مہاتیر محمد اس لہجہ میں بات کیا کرتے تھے، مگر اب وہ نہ صرف یہ کہ اقتدار میں نہیں ہیں بلکہ صاحب فراش بھی ہیں۔ اس لیے ہمارے جیسے نظریاتی کارکن ان کی صحت یابی کی دعا کے ساتھ ساتھ اس تمنا کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ اے کاش کسی مسلم ملک کا کوئی نمائندہ اقوام متحدہ کے فورم پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بات کرے۔ اس لیے ہمیں ڈاکٹر ملیحہ لودھی کی یہ باتیں بہت اچھی لگی ہیں اور ہم ان کے لیے سعادت دارین کی دعا کرتے ہیں، آمین یارب العالمین۔

اقوام متحدہ کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے بہت سی باتیں کرنے کی ہیں اور کیونکہ گزشتہ ستر برس سے ایسے معاملات جمع ہوتے جا رہے ہیں جن پر بات کرنے کی ضرورت ہے مگر سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ کو کسی مناسب

فورم پر نہیں اٹھایا رہا، اس لیے یہ فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے۔ ہم بھی ایک عرصہ سے اقوام متحدہ اور عالم اسلام سے متعلقہ مسائل و معاملات پر اپنے محدود دائرہ میں کچھ نہ کچھ کہہ اور لکھ رہے ہیں اور اس موضوع کے طلبہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند گزارشات اس موقع پر بھی ارباب فکر و دانش کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔ اس امید پر کہ ہوسکتا ہے ان معروضات کو کوئی بہتر زبان یا فورم میسر آ جائے اور وہ وہاں تک رسائی حاصل کر سکیں جہاں ان گزارشات پر سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ملیحہ لودھی کی مذکورہ بالا گفتگو کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ اور عالم اسلام کے تعلقات کی موجودہ صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا کے کم و بیش سب ہی مسلم ممالک ایک آدھ کی استثناء کے ساتھ اقوام متحدہ کا حصہ ہیں، اس کے نظام میں شریک ہیں اور اس کے مثبت اور منفی فیصلوں کا دائرہ کار ہیں، مگر مسلمانوں کے طور پر ان کا تشخص کسی جگہ بھی تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا رہا کہ دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمان نہ تو اپنے مذہبی تشخص سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی قرآن و سنت کے معاشرتی احکام کو اپنی انفرادی، خاندانی اور اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے پر آمادہ ہیں۔ پوری دنیا میں مجموعی صورت حال یہی ہے مگر اسے تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے۔ اور بلا وجہ فرض کر لیا گیا ہے کہ دنیا کی باقی آبادی کی طرح مسلمان بھی مذہب کے معاشرتی کردار سے کنارہ کش ہو گئے ہیں یا انہیں اس پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک مغرب اور عالم اسلام کے درمیان موجودہ کشمکش اور اس میں دن بدن شدت پیدا ہوتے چلے جانے کی اصل وجہ یہی ہے۔ اس لیے جب تک یہ معروضی حقیقت تسلیم نہیں کر لی جاتی کہ مسلمان آج بھی اللہ تعالیٰ، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و سنت پر بے لچک یقین رکھتے ہیں اور ان کے احکام و قوانین کو اپنی معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اس وقت تک باقی امور میں بہتری کی طرف کسی پیش رفت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اقوام متحدہ اور مغربی قیادت کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے معاشرتی وجود اور مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی نفی کرنے اور اسے نظر انداز کرتے چلے جانے کی بجائے اسے ایک زمینی حقیقت کے طور پر تسلیم کریں اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ معاملات کو از سر نو طے کرنے کی کوئی صورت نکالیں۔ ورنہ اقوام متحدہ اور مغربی طاقتوں کے بارے میں مسلم دنیا کی بے چینی اور اضطراب میں بہر حال اضافہ ہوتا رہے گا، فاصلے بڑھتے رہیں گے اور بے اعتمادی اور نفرت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اقوام متحدہ کے ساتھ سنجیدگی کے ساتھ کرنے کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور سمیت ان تمام بین الاقوامی معاہدات پر مسلم دنیا کے تحفظات بدستور موجود ہیں جو آج کے عالمی نظام کی بنیاد تصور کیے جاتے ہیں اور عملاً بین الاقوامی قوانین کا درجہ رکھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ اگر اپنے اوپر لاگو ہونے والے قوانین کو اپنے عقائد کے منافی سمجھتا ہو اور ان کے اصولی اور اخلاقی جواز پر تحفظات رکھتا ہو تو باہمی اعتماد کی فضا قائم نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ایسے ماحول کو کسی بہتر مستقبل کا پیش خیمہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اقوام متحدہ کے ساتھ یہ معاملہ اٹھانا بھی ضروری ہے کہ دنیا کی کل آبادی کا کم وبیش ایک چوتھائی حصہ اقوام متحدہ کی پالیسی سازی کے نظام کا حصہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ فیصلے اور تنفیذ کی اصل قوت سلامتی کونسل کے پاس ہے جبکہ سلامتی کونسل میں اصل اتھارٹی ''پانچ ویٹو پاورز'' ہیں جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کا نظام ہے۔ اس دائرہ میں نہ کوئی مسلم ملک شامل ہے اور نہ ہی کسی مسلم ملک یا مسلمان ملکوں کے کسی اجتماعی فورم کی وہاں تک رسائی کا کوئی امکان ہے۔ اس لیے پالیسیوں کی تشکیل اور نفاذ کے موجودہ نظام کو دنیائے اسلام ''ون وے ٹریفک'' سمجھتی ہے اور خاص طور پر مسلم ممالک کے بارے میں سلامتی کونسل کے فیصلوں کو ''یکطرفہ فیصلے'' تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس ماحول کو عملی طور پر تبدیل کیے بغیر باہمی تعلقات اور رویوں میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔

مگر اقوام متحدہ سے بات کرنے سے قبل ان مسائل پر عالم اسلام کے علمی، فکری اور دینی مراکز میں مباحثہ ضروری ہے۔ اقوام متحدہ کے معاہدات، قوانین، فیصلوں اور پالیسیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے موجودہ عالمی نظام کے بارے میں مسلمانوں کی شکایات، تحفظات اور مطالبات کو مرتب کرنے اور دانش ومنطق کی زبان میں اسے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اسلامی یونیورسٹیوں، بڑے دینی مدارس اور علمی وفکری مراکز کو خواب غفلت سے بیدار کرنا وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔ ہم تو صرف گزارش ہی کر سکتے ہیں جو اس امید کے ساتھ کرتے رہتے ہیں کہ

شاید کہ اتر جائے ''کسی'' دل میں مری بات

اللہ پوچھے گا

سپریم کورٹ کے محترم جج جسٹس (ر) سرمد جلال عثمانی اپنی مدت ملازمت پوری کر کے عدالت عظمیٰ سے رخصت ہو گئے ہیں مگر جاتے جاتے ملک کے دینی حلقوں کو بے چین اور متحرک کر گئے ہیں۔ سابق چیف جسٹس جناب جواد ایس خواجہ نے رخصت ہوتے ہوئے قومی زبان اردو کے بارے میں تاریخی فیصلہ صادر کر کے ایک کریڈٹ اپنے نام تاریخ میں محفوظ کر لیا تھا، جبکہ جسٹس (ر) سرمد جلال عثمانی نے بھی جاتے ہوئے سودی نظام کے خلاف حافظ عاکف سعید کی رٹ مسترد کر کے اور متناز عد ریمارکس دے کر ایک ''کریڈٹ'' اپنے نام ریکارڈ کرا دیا ہے۔ انہوں نے عدالت عظمیٰ کے جج کے طور پر فرمایا کہ سودی نظام ختم کرانا سپریم کورٹ کا کام نہیں اور نہ ہی وہ سپریم کورٹ میں مدرسہ کھول کر کے سود کے حرام ہونے کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اور یہ کہ جو سود نہیں لینا چاہتے وہ نہ لیں اور جو لے رہے ہیں ان سے خود اللہ تعالیٰ پوچھ لے گا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

جسٹس عثمانی کے ان ریمارکس نے ملک بھر کے دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی فکرمند اور بے چین کر دیا ہے جو قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے ارشاد کے مطابق ملک کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کہ کوئی شخص رخصت ہوتے ہوئے اپنے بارے میں کیا تاثر چھوڑ کر جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''العبرۃ بالخواتیم'' کہ آخرت میں نجات کا

دارومدار انسان کی دنیوی زندگی کی آخری کیفیات پر ہوتا ہے۔ جبکہ قومی شخصیات کی معاشرتی زندگی میں بھی یہی اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے کہ اپنی سروس مکمل کر کے جس کیفیت میں وہ رخصت ہوتے ہیں وہ قوم کو ہمیشہ یاد رہتی ہے اور تاریخ بھی اسے اپنے ریکارڈ میں محفوظ کر لیتی ہے۔

تنظیم اسلامی کے امیر حافظ عاکف سعید نے عدالت عظمیٰ سے درخواست کی تھی کہ حکومت سے کہا جائے کہ وہ دستور کی واضح ہدایت کے مطابق ملک میں سودی نظام کے خاتمے کا وعدہ پورا کرے۔ مگر جسٹس (ر) سرمد جلال عثمانی کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کے بینچ نے دوسرے فریق کو طلب کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی اور یہ کہہ کر رٹ سرسری سماعت میں ہی مسترد کر دی کہ یہ فیصلہ کرنا وفاقی شرعی عدالت کا کام ہے جو اس کے بارے میں کیس کی سماعت کر رہی ہے۔ بات یہاں تک رہتی تو کسی حد تک سمجھ میں آ رہی تھی مگر جسٹس (ر) عثمانی کا یہ ارشاد سب کو حیران کر گیا کہ سودی نظام کے خاتمے کے لیے سپریم کورٹ کی سرے سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔ حالانکہ سودی نظام کے فوری خاتمہ کے لیے دستور پاکستان نے واضح طور پر حکومت کو پابند کر رکھا ہے اور حکومت کو دستوری احکامات کی تعمیل و تکمیل کی ہدایات دینا اور ان کی نگرانی کرنا عدالت عظمیٰ کی بنیادی ذمہ داری شمار ہوتا ہے۔

بہرحال ہم اس بحث میں سر دست نہیں پڑنا چاہتے۔ حافظ عاکف سعید اگر اس فیصلہ اور ریمارکس کے خلاف اپنا دستوری حق استعمال کرتے ہوئے نظر ثانی کے لیے عدالت عظمیٰ میں گئے اور اس پر فریقین کو بلا کر دونوں کا موقف سنا گیا تو سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ البتہ ملک بھر میں اس پر جس پریشانی اور بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے، اس کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ متعدد دینی جماعتوں کے راہ نماؤں کے اخباری بیانات قومی پریس کی زینت بن چکے ہیں جبکہ مختلف مکاتب فکر کا ایک مشترکہ فورم ''تحریک انسداد سود پاکستان'' موجود ہے جس کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ذمہ داری دوستوں نے مجھے سونپ رکھی ہے۔ اس لیے جہاں جاتا ہوں دوست پوچھتے ہیں، ردعمل معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں آئندہ لائحہ عمل کی بات کرتے ہیں۔

11 اکتوبر کو سیالکوٹ گیا تو وہاں کے معروف دینی و سماجی راہ نما پیر سید شبیر احمد گیلانی نے علماء کرام کی ایک محفل اسی حوالہ سے سجا رکھی تھی جس میں اس مسئلہ پر باہمی مشاورت ہوئی اور دوستوں نے مختلف تجاویز و تاثرات سے نوازا۔

13 اکتوبر کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مختلف دینی جماعتوں کے راہ نماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس مولانا خالد حسن مجددی کی صدارت میں ہوا جس میں طے پایا کہ شہر کے بڑے مراکز میں سودی نظام کے خلاف بیداری پیدا کرنے کے لیے کنونشن منعقد کیے جائیں گے۔ جبکہ چیمبر آف کامرس کے راہ نما میاں فضل الرحمٰن چغتائی نے بتایا کہ چیمبر میں بھی اس سلسلہ میں کنونشن کا انعقاد عمل میں لایا جائے گا۔

15 اکتوبر کو لاہور میں متحدہ علماء کونسل پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف ملک کی رہائش گاہ پر ان کی صدارت میں دینی جماعتوں کے سرکردہ حضرات کا مشاورتی اجلاس ہوا جس میں مولانا محمد امجد خان، حافظ عاکف سعید، مولانا محمد رمضان، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، جناب امیر العظیم، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مولانا مجیب الرحمٰن

انقلابی، مولانا حافظ محمد سلیم، مولانا یونس حسن، جناب عابد محمود قریشی اور دیگر حضرات شریک ہوئے۔ راقم الحروف بھی حاضر تھا اور باہمی مشاورت سے طے پایا کہ دینی حلقوں اور رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنے کے لیے تحریک کا آغاز کیا جائے گا۔ اور تمام طبقات بالخصوص تاجر برادری، صحافی حضرات اور اساتذہ وطلبہ کو توجہ دلائی جائے گی کہ ملک سے سودی نظام کا خاتمہ شرعی ذمہ داری ہونے کے ساتھ ساتھ دستوری تقاضہ بھی ہے اور اس سلسلہ میں حکومت اور دیگر ریاستی اداروں کی بے پرواہی افسوس ناک ہے۔

اجلاس میں حافظ عاکف سعید، جناب اوریا مقبول جان اور راقم الحروف کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ سودی نظام کے خاتمہ کے لیے قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل جاری تحریک اور اس کے تقاضوں کے حوالہ سے ایک جامع ''بریفنگ رپورٹ'' مرتب کر کے تمام طبقات اور اداروں کو بھجوائی جائے اور اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر ''علماء کنونشنوں'' کا اہتمام کیا جائے۔ اس بات پر بطور خاص زور دیا گیا کہ سب سے زیادہ علماء کرام کو اس کے لیے متحرک ہونا چاہیے جبکہ علماء کرام کو سودی نظام کے خاتمہ کی جدوجہد کے پس منظر اور پیش رفت سے آگاہ رکھنے کے لیے منظم محنت کرنا ہوگی۔ کیونکہ علماء کرام سود کی حرمت اور نحوست سے تو بخوبی واقف ہیں مگر ان کی اکثریت سودی نظام کے خلاف جدوجہد کی صورت حال سے آگاہ نہیں ہے۔

> ''مدارس کے متعلق میری ایک رائے یہ ہے کہ دینی مدارس میں صنعت وحرفت کا بھی انتظام ہو، خواہ طلبہ بعد میں یہ کام نہ کریں، لیکن سکھایا ضرور جائے۔ اس لیے کہ آج کل عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مولویوں کو اس کے سوا اور کچھ نہیں آتا، اس لیے وہ انھیں اپنا محتاج سمجھتے ہیں جس سے ان کی تحقیر ہوتی ہے۔ اگر کوئی دستکاری وغیرہ سیکھ لیں اور کسی وقت کسب معاش کی ضرورت ہو تو اپنے کام میں تو لگ جائیں گے اور اس طرح چندہ مانگنے سے بچ جائیں گے، اس لیے کہ چندہ مانگنے میں حد درجہ تحقیر ہے۔''
>
> (حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، الافاضات الیومیہ، حصہ ششم ص ۲۶۶)

حالات وواقعات

حافظ عاکف سعید*

سود کا خاتمہ: ریاست کی ذمہ داری

سود کے حوالے سے سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا ہے۔ اخبارات میں آیا ہے کہ میری طرف سے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی گئی تھی کہ ہمارے دستور کا آرٹیکل 38 کہتا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں سود کا خاتمہ کرے۔ ہمارے دستور میں اسلامی شقیں موجود ہیں، لیکن کچھ چور دروازے بھی ہیں۔ دستور میں اسلام کا اچھا خاصا مواد موجود ہے، مگر جتنا کچھ ہے، افسوس یہ ہے کہ اس پر عملدرآمد نہیں ہے۔ یہ المیہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سود کتنا بڑا گناہ ہے۔ قرآن مجید میں جو الفاظ سود کی قباحت وشناعت کے بارے میں آئے ہیں، وہ کسی اور گناہ کے لیے نہیں آئے۔ یعنی تم سودی لین دین سے باز نہیں آتے تو اللہ اور رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اللہ اور رسولؐ سے جنگ ہو تو ہمارے لیے رتی بھر خیر کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ پھر ہماری دعائیں قبول کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس سے زیادہ خطرناک کوئی شے نہیں۔

عملی گناہوں میں سود سب سے بڑا گناہ ہے۔ ایک ہے نظری یا عقیدے کا گناہ، جیسے شرک یا کفر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کا مفہوم ہے کہ سود کے ستر حصے ہیں جن میں سے سب سے ہلکا حصہ ایسا ہے گویا کوئی انسان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے زبان لڑکھڑا جاتی ہے، لیکن اس معاملے میں ہم اتنے ڈھیلے واقع ہوئے ہیں کہ گویا ہمیں کوئی سروکار ہی نہیں۔ لاپروائی کی انتہا ہے۔

درحقیقت ہم نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی تھی، جو بڑی مشکلوں سے سماعت کے لیے منظور ہوئی۔ اس میں موقف اختیار کیا گیا تھا کہ آئین کے آرٹیکل 38 کے تحت یہ حکومت کی ذمہ داری ہے وہ ملک سے سود کا خاتمہ کرے۔ ہم سود کی وجہ سے اللہ اور رسولؐ کے خلاف حالت جنگ میں ہیں۔ اس کا سپریم کورٹ نوٹس لے اور حکومت کو فوری طور پر متوجہ کرے۔ اس پر وہاں سے جواب آیا کہ یہ ہمارا کام نہیں، یہ معاملہ وفاقی شرعی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس کا فیصلہ وہیں ہوگا۔ درخواست خارج کر دی گئی، لیکن سپریم کورٹ کے جسٹس سرمد جلال عثمانی جن کی سربراہی میں یہ بنچ قائم ہوا تھا، کے ریمارکس عجیب وغریب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو سود نہیں لیتا نہ لے، اور جو لیتا ہے اس سے اللہ پوچھے گا۔ ان

*مرکزی امیر تنظیم اسلامی پاکستان۔

کی بات کو صحیح مان لیں تو پھر ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ حکومت اپنے فرائض منصبی ادا کرے تو اچھی بات ہے، اور اگر نہ کرے تو اللہ پوچھے گا۔ فوجی جرنیل آئین کی پاسداری کریں اچھی بات ہے، حلف توڑ کر اقتدار پر قابض ہو جائیں تو اللہ پوچھے گا۔ جج منصفانہ فیصلے کرے تو اچھی بات ہے، اور اگر انصاف کا خون کرے تو اللہ پوچھے گا۔

میں اور یا مقبول جان کے حالیہ مضمون کا وہ حصہ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ سود کے معاملے میں ہم نے جو کیا ہے، وہ دردناک ہے۔ ہم ایک خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا ''میں بینک کے تحقیقی کام کا خود باریک بینی سے جائزہ لوں گا کہ وہ ایک ایسا بینکنگ نظام وضع کرے جو اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کیے ہیں۔ مغرب کا معاشی نظام سودی ہے۔'' اس تقریر کے ڈھائی ماہ کے بعد قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد سترہ سال تک طویل خاموشی رہی۔ آئین میں نظریاتی کونسل ہر دور حکومت میں موجود رہی لیکن کسی کو سود کے بارے میں کبھی کوئی خیال نہیں آیا۔ ایوبی آمریت کے دوران 66-1964 کے عرصے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بینکنگ کے نظام کا جائزہ لیا اور اسے خلاف اسلام قرار دیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل دستور کا حصہ ہے اور اسے اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ ملک میں قانون سازی قرآن وسنت کے دائرے میں ہوگی۔ یہ ادارہ اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہ نشان دہی کرے گا کہ کون کون سے قوانین غیر اسلامی ہیں اور ایسے قوانین کے متبادل تجویز کرے گا۔ اس ادارے میں ملک کے بڑے بڑے اسکالرز اور مکاتب فکر کے علماء کو شامل کیا گیا۔ 700 سے زیادہ قوانین کے بارے میں کونسل نے رائے دی کہ یہ غیر اسلامی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری دور میں آئین میں یہ شق شامل کی گئی جس کے ذریعے حکومت کو ذمہ داری دی گئی کہ سود کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔

افسوس آج تک بانی پاکستان کی خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا ہے۔ اور ہم نے جب اللہ اور رسولؐ کے خلاف جنگ کے الٹی میٹم کو قابل اعتناء نہیں سمجھا تو مسلسل عذاب کے کوڑے برس رہے ہیں۔ نااہل حکمرانوں کا مسلط ہو جانا بھی اللہ کے عذاب کی ایک صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں درست راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(بشکریہ روزنامہ ''اسلام'')

حالات وواقعات

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ

اردو پر کرم یا ستم؟
سپریم کورٹ کے فیصلے پر تبصرہ

جسٹس ج-س-خواجہ نے اردو کو بطور سرکاری زبان رواج دینے کے دستوری تقاضے کے بارے میں بطور چیف جسٹسؒ اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک روز پہلے جو فیصلہ دیا ہے، اس پر تحسین وتعریف کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ یہ فیصلہ اردو کی دادرسی کا کس حد تک ذریعہ بنتا ہے، یہ وقت بتائے گا - ماضی تو بہرصورت مایوس کن ہے۔ کوئی بابائے اردو بھی نہیں جو صورت حال کو بدلنے کے لئے میدان لگائے۔ ہم اس فیصلے میں پائے جانے والے inherent ommissions پر کچھ کہنا چاہیں گے۔ مقصود بہتری کے امکانات سامنے لانا ہے۔

اردو کا موجودہ کیس سپریم کورٹ میں دو آئینی درخواستوں کا نتیجہ ہے۔ درخواست نمبر ۵۶ سال ۲۰۰۳ میں جناب محمد کوکب اقبال صاحب کی جانب سے دائر ہوئی جو سپریم کورٹ کے وکیل اور شہری حقوق کی ایک این جی او کے چیئرپرسن ہیں۔ دوسری درخواست نمبر ۱۱۲، سال ۲۰۱۲ میں سید محمود اختر نقوی نے دائر کی۔ موجودہ فیصلہ ج-س-خواجہ نے صادر فرمایا ہے۔ وہ چوبیس روز کے لیے پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔ اس کیس کا فیصلہ انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک روز پہلے فرمایا۔ کمال یہ ہے کہ اردو کی تقدیر کا فیصلے کرنے بیٹھے ہیں مگر یہ فیصلہ بھی انہوں نے آدھا اردو میں اور آدھا انگریزی میں تحریر کیا۔ یہ امر بھی ان کے کریڈٹ میں ہے کہ انہوں نے اپنی سروس کے دوران دو چار فیصلے اردو میں تحریر کیے ہیں۔ یہ ان کا اردو پر احسان عظیم ہے۔ جسٹس جواد خواجہ کے چند اردو فیصلے خود ان کے لیے کسی incentive کا باعث نہیں ہوئے تو کسی اور پر کیا اثر ڈالیں گے۔

بہرحال جناب جسٹس خواجہ صاحب کے آخری فیصلے کا سرسری مطالعہ کرنے پر سب سے پہلے جو چیز بری طرح کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ فیصلہ میں بارہ تیرہ سال لگے۔ انصاف میں تاخیر انصاف کی نفی ہے۔ اب اس تاخیر کے ذمہ دار کون ہیں، اس کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وکلا یا فریقین کا اس میں کوئی حصہ ہے تو ادارے کے طور پر تمام تر ذمہ داری عدلیہ پر ہی عائد ہوگی۔ فیصلے کے متن سے واضح ہے کہ دائری کے بعد بارہ تیرہ سال میں ایک بار ہی سماعت

ہوئی۔ یہ سماعت ۲۰۱۵-۸-۲۶ کو ہوئی۔ فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ سال رواں میں اٹھارہ بار کیس سماعت کے لیے لگا۔ پھر ان پیشیوں پر کیا ہوا؟ عدالت نے چودہ پیشیوں کی کارروائی کا چارٹ مرتب کر کے اسے فیصلے کا حصہ بنایا ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فریقین اور فاضل عدالت نے وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ کیا کوئی وقت کا حساب لے سکتا ہے؟ اس سے status quo مزید طاقت ور ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تمام ادارے یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اردو کی ترویج کے لیے لوگوں کی طرف سے جتنی عرضیاں اعلیٰ عدالتوں کے ڈبوں میں ڈالی گئیں، شاید کوئی پسند نہیں کرے گا کہ ان کی تفصیلات جمع اور جاری کی جائیں۔ فیصلہ کے بارے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ دستور کے آرٹیکل ۲۵۱ (۱) کے الفاظ بڑے واضح ہیں کہ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے انتظامات کیے جائیں گے۔ اس آرٹیکل میں انتظامات کی ذمہ داری پورا کرنے کے لیے حکومت یا کسی ادارے کا تذکرہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مملکت کا ہر ادارہ، اپنے اپنے دائرہ کار میں، اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ جناب جواد خواجہ صاحب چوبیس روز تک پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔ کاش وہ سپریم کورٹ اور ہائیکورٹس کو ہدایت جاری کر دیتے کہ وہ اپنی ذمہ داری پورا کرتے ہوئے اردو کو سماعت اور فیصلے کی زبان کے طور پر اختیار کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چیف جسٹس صاحب نے ایسا اس لیے نہ کیا کہ درخواست گذاروں نے اس کے لیے اپنی درخواستوں میں کوئی دادرسی نہیں مانگی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے suo moto کس بیماری کا نام ہے؟

جناب ج-س-خواجہ صاحب نے فیصلے میں سائلان کے دلائل اور اپنی آبزرویشنز کے حوالے سے حکومتوں کے غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کو کافی نمایاں کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"5. Indeed, the importance of this issue cannot be emphasized enough. Yet, the way in which this issue is being dealt with by the Government, has been very casual and non serious.''

6. During the course of this year alone, these petitions have come up for hearing before this Court eighteen times. However, despite the time the Court dedicated to this crucial issue, no substantial progress was made. On 12.5.2015, for instance, Mr Abdul Rashid Awan, Deputy Attorny General for Fedration clearly submitted that in spite of his best efforts the Secretary Cabinet and the Secretary Information, Government of Pakistan, and other concerned functionaries were not paying any heed to the Constitutional imperative in Article 251.

''۵۔ بے شک اس تنازعے کی اہمیت پر زیادہ زور بیان صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود

حکومت اور سیکریٹری کیبنٹ اور سیکریٹری انفرمیشن نے اس بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ بہت معمولی اور غیر سنجیدہ ہے۔''

''۶۔ صرف رواں سال میں یہ درخواستیں اٹھارہ بار سماعت کے لیے لگائی گئیں۔ عدالت نے ہر حال میں اپنے کام میں پوری یکسوئی سے کام لیا۔ اس کے باوجود کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بطور مثال مورخہ ۱۲-۵-۲۰۱۵ کو جناب عبدالرشید ڈپٹی اٹارنی جنرل نے وفاق کی جانب سے واضح طور پر فرمایا کہ ان کی بہترین کوششوں کے باوجود حکومت پاکستان کے سیکریٹری کیبنٹ اور سیکریٹری انفرمیشن اس آرٹیکل ۲۵۱ کے دستوری تقاضے پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

اس کے بعد فیصلے کے سات سے نو صفحات پر ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) کی سفارشات ۱۹۸۱ درج کی گئی ہیں۔ یہ سفارشات جز والف، ب اور ج کی صورت میں ہیں۔ جز والف اردو کی ترویج بطور دفتری زبان، جز وب اردو کو ذریعہ تعلیم اور جز وج مقابلے کے امتحانات اردو میں لینے کی بابت ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے یہ سفارشات درج نہیں کر رہے۔ فیصلے کا یہ حصہ لائق توجہ ہے۔ مزید براں حکومت پاکستان کی جانب سے کابینہ سیکریٹریٹ کا بینہ ڈویژن کا خط مورخہ ۶-جولائی ۲۰۱۵ء بھی فیصلہ کا حصہ ہے۔ اس سب کچھ کے بعد عدالت پیرگراف نمبر ۱۶ میں لکھتی ہے:

"We may also emphasise here that implementing Article 251 is not just a matter of obeying the constitution; it has real practical implications for Pakistani public. In this regard, we may refer to a highly relevant historical fact. In 1972, the provincial government in Balochistan led by the Chief Minister and the provincial governmenti N W F P led by CM Maulana Mufti Mahmud, took some concrete steps towards introducing Urdu as the officaial language in their respective Provinces.

''ہم اس بات پر زور دے سکتے ہیں کہ آرٹیکل ۲۵۱ کا معاملہ صرف دستور کے اتباع کا معاملہ نہیں، یہ لوگوں کے لیے بہت سے عملی اور حقیقی مضمرات کا حامل ہے۔ یہاں ہم تاریخ کے ایک بہت ہی متعلق واقعے کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ ۱۹۷۲ میں بلوچستان کی صوبائی حکومت اور شمال سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود نے اپنے اپنے صوبوں میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے تھے۔''

اس کے بعد فاضل جج ایم ایم اے کی حکومت کے دوران اردو کے نفاذ کا بھی ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اس سے دفتری خط و کتابت اور noting میں کافی سہولت اور بہتری آئی۔ اس پس منظر میں عدالت فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۹ میں نو ہدایات جاری کرتے ہیں۔ ہم متعلقہ حصہ یہاں نقل کرنا وقت کا ضیاع خیال نہیں کرتے۔ ہدایت نامہ اس طرح ہے:

19 Therefore, bearing in mind the constitutional commands in Article 5 and 251 reproduced above and noting the in-action and failure of successinve governments to implement this important provision, we have no option but to order as under:

''۵-لہٰذا دستور کے آرٹیکل ۵ اور ۲۵۱ کی دستوری ہدایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور حکومتوں کے ان دفعات پر عمل کرنے میں مسلسل ناکامی کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے پاس درج ذیل ہدایات کے صادر کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں:

i) The provisions of Article 251 shall be implemented with full force and without unnecessary delay by the Federal and Provincial Governments;

ii) the time-lines (given in letter dated 6-7-2015 reproduced below) which are given by the Government itself must be considered for implementation by the Government in line with Article 251 for implementation;

iii) the Federal Government as well as Provincial Governments should coordinate with each other for uniformity in the (رسم الخط) "rasmulkhat" for the National landguage;

iv) Federal as well as provincial laws should be translated in the National language within three months;

v) statutory, regulatory and oversight bodies shall take steps to implement Article 251 wihtout unnecessry delay and also ensure compliance by regulatees;

vi) In the competitive examinations at Federal level, the recommendations of goverment bodies noted above, should be considered by the Government for implementation without unnecessary delay;

vii) Judgments in cases relating to public interest, litigation and judgments enunciating a principle of law in terms of Article 189 must be transtated in Urdu and should be published in line with Article 251 of the constitution;

viii) In Court cases, government departments should make all reasonable efforts to submit their replies in Urdu to enable citizens to effectively enforce their legal rights;

ix) If, subsequent to the judgment, any public bodies or public officials continue to violate the constitional command contained in Article 251, citizens who suffer a tangible loss directly and foreseeably resulting from such violation shall be entitled to enforce any civil rights which may accrue to them on this account.

(I) وفاقی اور صوبائی حکومتیں آرٹیکل ۲۵۱ کو پوری قوت سے بلا غیر ضروری تاخیر نافذ کریں گی۔

(II) خط مورخہ ۲۰۱۵-۷-۶ (منجانب ڈاکٹر ارم انجم خان، جوائنٹ سیکریٹری کابینہ) اور آرٹیکل ۲۵۱ میں درج مہلت کا لحاظ رکھتے ہوئے آرٹیکل ۲۵۱ کو نافذ کیا جائے گا۔

(III) وفاقی اور صوبائی حکومتیں رسم الخط کی یکسانی کے لیے باہم مربوط اقدامات کریں گی۔

(IV) وفاقی اور صوبائی قوانین کو قومی زبان میں تین ماہ کے اندر اندر ترجمہ کرایا جائے گا۔

(V) قانون کے تحت قائم نظامتیں، قواعد وضوابط بنانے اور نگرانی کا کردار ادا کرنے والے ادارے آرٹیکل ۲۵۱ پر عمل درآمد کے لیے اقدامات کریں گے۔

(VI) وفاقی اور صوبائی حکومت کے زیر اہتمام مقابلے کے امتحانات کے بارے میں مختلف اداروں کی جانب سے پیش کردہ سفارشات پر بغیر کسی تاخیر عمل کیا جائے گا۔

(VII) مفاد عامہ اور اہم اصول قانون بیان کرنے والے فیصلوں کا ترجمہ کرانے اور ان کو چھاپنے کا اہتمام کیا جائے گا۔

(VIII) عدالتوں کے سامنے مقدمات میں حکومتیں اپنے جوابات ممکنہ حد تک اردو میں پیش کریں گی، تاکہ لوگ اپنے قانونی حقوق کا تحفظ کر سکیں۔

(IX) موجودہ فیصلے کے بعد، اگر کوئی حکومتی ادارہ یا حکومتی افسران دستور کے آرٹیکل ۲۵۱ کی عدم اطاعت جاری رکھیں تو بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثرہ شہری اپنے شہری حقوق نافذ کروانے کا حق رکھتے ہیں۔

فاضل عدالت نے دستور کے آرٹیکل ۲۵۱ میں لفظ shall کا اطلاق کر کے حکومت کو نو ہدایات جاری کی ہیں جو اوپر درج کر دی گئی ہیں۔ کاش اسی shall کا اطلاق کر کے سپریم کورٹ، ہائیکورٹس اور ماتحت عدالتوں کو اردو میں کام (سماعت اور فیصلہ) کرنے کی ہدایت بھی جاری کر دیتے۔ معقولیت اور انصاف کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ وفاق کو نو ہدایات پر مشتمل طویل ہدایت نامہ کتنا ہی مکمل ہو، اس میں تعبیرات اور توجیہات کی ہر طرح کی گنجائش ہے۔ حکومت اور انتظامیہ فیصلے پر عملدرآمد سے بچنے کے لیے چور دروازے ڈھونڈ نکالیں گے جس کی ماضی میں کئی مثالیں موجود ہیں۔ اگر کوئی چیف جسٹس کچھ کرنا چاہے تو ہر دور میں کام کرنے والوں نے کام کیا ہے۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ کرنے کے لیے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس محمد افضل ظلہ نے جو اقدامات (3a) کئے اور ان کو حکومتوں سے موثر طور پر منوایا، وہ ہماری عدلیہ کی تاریخ کا یقینی طور پر سنہرا باب ہے۔ اسی طرح جب سپریم کورٹ نے قصاص ودیت کے حوالے سے یہ

قرار دیا کہ اگر پارلیمان شریعت کے منافی قرار دیے گئے قانون کو دی گئی مہلت کے اندر قانون سازی نہیں کرتی یا حکومت کا جاری کردہ آرڈیننس کسی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے تو بھی قصاص ودیت سے متعلقہ قرآن وسنت کے احکام موثر ہوں گے۔ (قصاص دیت کیس، پی ایل ڈی ۱۹۹۰، سپریم کورٹ ۱۱۷۲)

۱۹۸۶ کے سید کمال کیس میں ۱۹۱۳ سے رائج قانون شفعہ کو خلاف شریعت قرار دے دیا گیا۔ اسے شریعت کے مطابق بنانے کی ہدایات میں جو سفارشات درج کی گئیں، وہ اس حق کو ختم کر دینے والی تھیں۔ اس کے باوجود صوبائی حکومتوں نے جس طرح کا بلی چوہے کا کھیل شروع کیا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ خاص طور پر پنجاب حکومت نے تو انتہا کر دی۔ ۱۹۸۶ تا ۱۹۹۰ کوئی قانون ہی نہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاتی عمرا کے لیے شریفوں کی جانب سے اراضی کی وسیع خریداریاں کی جا رہی تھیں۔ آخر کار سپریم کورٹ نے پنجاب حکومت سے شفعہ کا نیا قانون بنوا ہی لیا۔ یہ کس حد تک اسلامی ہے اور کس حد تک جاگیردارانہ ذہن کا آئینہ دار ہے، ایک الگ موضوع ہے۔

کاش جسٹس ج-س-خواجہ کو اللہ تعالیٰ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے عزم کا عشر عشیر ہی عطا کر دیتا تو اور وہ اپنے ادارے کو دستوری پابندی کی ہدایت جاری کر دیتے۔ اتنا کر دینے کے بعد صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے لیے کوئی ہدایت نہ بھی جاری کرتے تو ان کے اقدامات کو ہر شہری اپنے لیے ریلیف محسوس کرتا۔ اس کے بعد اگر وفاق اور صوبائی حکومتوں کو اتنی ہی ہدایت کر دیتے کہ قانون کا قابل نفاذ متن اردو میں جاری ہوگا تو ان کا فیصلہ تاریخ کا دھارا بدل دیتا۔ یہاں ہم سوچنے پر مجبور ہیں کہ حکومتوں اور ان کے اداروں نے اردو کے ساتھ جو کچھ کیا، وہی کچھ عدلیہ بھی کرتی آ رہی ہے۔ چیف جسٹس جواد صاحب نے اس کے بارے میں کیوں کچھ کہا نہ کیا؟ یہاں فیصلہ سے پیرا گراف نمبر ۱۰ اور ۱۱ کا کچھ حصہ نقل کرنا چاہتے ہیں:

''یہاں رہنمائی کے لیے بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:

ایک بچے کی ماں اپنے بچے کو بابا صاحب کے پاس لائی۔ اس نے شکایت کی کہ بچہ گڑ بہت کھاتا ہے، اسے نصیحت کریں۔ بابا جی نے ایک ہفتے بعد آنے کے لیے کہا۔ جب وہ دوبارہ بچے کو ساتھ لائی تو بابا جی نے اس کو گڑ نہ کھانے کی نصیحت کی۔ بچے نے اسے مان لیا اور گڑ کھانا چھوڑ دیا۔ اس موقع پر بچے کی ماں نے بابا جی سے دریافت کیا کہ انہوں نے یہی نصیحت پچھلے موقع پر کیوں نہ کر دی؟ اس پر بابا جی نے جواب دیا کہ ان دنوں وہ خود کثرت سے گڑ استعمال کر رہے تھے، اس وجہ سے وہ بچے کو گڑ کھانے سے منع نہیں کر سکتے تھے۔''

یہاں کیسے کہوں کہ دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت کی مثال جسٹس صاحب پر ہی نہیں بلکہ ان کے پورے ادارے پر صادق آتی ہے۔

اردو کے نفاذ کے لیے دستور کے آرٹیکل ۲۵۱ میں ۱۹۷۳ پانچ سال کی میعاد مقرر کی گئی تھی۔ بعد میں اسے پندرہ سال کر دیا گیا۔ میعاد کا تعین، پرلے درجے کی منافقت تھی۔ یہ دستور اس طرح کی منافقتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کی بنیاد پر اسے متفقہ دستور کہا جاتا ہے۔ اردو تو ہمارے اندر ہمیشہ سے موجود ہے۔ اسے بولنے، لکھنے اور اختیار کرنے کے

لیے ہمیں کسی میعاد کی ضرورت نہیں۔ ایک زمانے میں ایک سابق چیف جسٹس نے کہا تھا کہ اردو میں کام کرنے کے لیے ہمیں صرف حکم کی ضرورت ہے۔ حکم ہوتے ہی تمام جج اردو میں کام شروع کر دیں گے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ابھی ۱۹۷۳ کا دستور نہیں بنا تھا۔ اصل پریشانی یہ ہے کہ ہم تقدیر کے فیصلے عدالتوں سے لینے لگے ہیں۔ ہمیں اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ اردو کی تقدیر تو روزِ اول سے طے ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی بابائے اردو جیسا عزم لے کر اٹھے، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا شوق ہو اور پھر دیکھئے اردو کی تقدیر۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دستور میں اردو کے ترویج کے لیے میعاد کا تعین دراصل اس کے نفاذ کو ٹالنے والے بات تھی۔ حکومتوں اور افسر شاہی نے ہی نہیں، اعلیٰ عدالتوں نے بھی ٹالنے کے اس عمل میں اپنا اپنا حصہ خوب ڈالا ہے۔ اگر جسٹس ج-س-خواجہ کے بعد آنے والے چیف جسٹس صاحبان ٹالنے کے اسی عمل کا حصہ بنے رہتے ہیں تو اردو کی تقدیر نہیں بدلے گی۔ اوپر درج ہدایت نامہ ایک بار پھر پڑھ لیں۔ میں نے اسے بار بار پڑھا ہے، ہر بار میرا گمان پختہ ہوا کہ اس پر عمل نہیں ہوگا۔ یہ مبہم ہدایات پر مشتمل ہے۔ عمل درآمد سے فرار کے ہزار راستے ان کے اندر موجود ہیں۔ مزید براں حکومتوں کی نالائقیاں اور نوکر شاہی کی بدنیتی اپنی جگہ ہوگی۔ ان ہدایات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ مقدموں میں جوابات، فیصلہ جات اور قوانین کے تراجم کیے جائیں۔ کیا یہ تراجم سند ہوں گے؟ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہوگا۔ اہم ترین بات یہی ہو سکتی تھی کہ سماعت، فیصلوں اور قانون کی زبان فوری طور پر آئندہ کے لئے اردو کر دی جائے۔

قصہ مختصر، اب ہم صرف دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غریب اردو کے لیے راہ نکالے۔ اس طرح ہر شہری کے لئے سہولت کا راستہ پیدا ہوگا۔ یہ مفاد عامہ کا معاملہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مفاد عامہ کا سپریم کورٹ کو خیال ہوتا تو کم کورٹ فیس پر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے (کورٹ فیس کیس، پی ایل ڈی ۱۹۹۲ وفاقی شرعی عدالت ۱۹۵) کے خلاف اپیل ۱۹۹۲ سے تعطل کا شکار نہ ہوتی۔ ربع صدی گزر چکی ہے۔ کبھی سنا نہیں کہ یہ اپیل سماعت کے لیے لگی ہو۔

حالات وواقعات

مولانا عبدالمتین منیری*

اک چراغ اور بجھا: مولانا سید نظام الدینؒ

۱۷؍اکتوبر کی شام کو خبر آئی کی حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انتقال کے وقت مولانا ملت اسلامیہ ہندیہ سے وابستہ اہم اور باوقار ذمہ داریوں اور امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے کئی ایک معزز عہدوں پر فائز تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۸ سال تھی۔ آپ کی ولادت باسعادت مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء محلّہ پرانی جیل، گیا بہار میں ہوئی تھی۔ مولانا کی رحلت کے ساتھ امت مسلمہ ہندیہ ایک سلجھے ہوئے، پرہیزگار، بردبار اور امانت دار قائد سے اس وقت محروم ہوگئی جب کہ آپ جیسی قیادت کی ملت کو پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔

مولانا کے والد ماجد قاضی سید حسین صاحب ایک جید عالم دین اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں میں تھے۔ آپ کی والدہ کی وفات ۱۹۳۰ء میں اس وقت ہوئی جب آپ نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ ابھی آپ کی عمر دودھ پینے کی تھی۔ چار سال کی عمر ہوئی تو ۱۹۳۱ء میں بسم اللہ خوانی سے آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا اور گھریلو تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں بہار کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں آپ کا داخلہ ہوا۔ ابھی عمر پندرھویں سال میں تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۹۴۲ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اصغر حسین وغیرہ اساطین علم سے کسب فیض کیا۔ جون ۱۹۴۲ء میں آپ کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ کی فراغت ہوئی اور آپ نے شیخ الادب مولانا اعزاز علی کے زیر سایہ ۱۹۴۶ء میں تخصص فی الادب کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد آپ ریاض العلوم ساٹھی، چمپارن میں تدریس سے وابستہ ہوگئے جہاں آپ نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۲ء تک بحیثیت صدر مدرس خدمات انجام دیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۰ء کو آپ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے تیسرے امیر مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کے انتقال کے بعد جب امارت جمود اور انتشار سے دوچار ہوگئی تھی تو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور دیگر اکابر کے اصرار پر مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے امیر شریعت کا منصب قبول کیا جس کے بعد آپ نے ۱۹۵۷ء میں مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب کو قاضی

* ammuniri@gmail.com

شریعت کے جلیل القدر عہدے پر فائز کیا۔ قاضی صاحب اس وقت نئے نئے دیوبند سے فارغ ہوکر آئے تھے اور عمر کے پچیسویں سال میں ابھی داخل نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا سید نظام الدین صاحب کی امیر شریعت مولانا رحمانی صاحب کے قائم کردہ ادارے میں آمد ہوئی اور یہیں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعت اور مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ رحمانیہ میں آپ کی دوبارہ آمد ہوئی اور ۱۹۶۳ء-۱۹۶۴ء میں آپ نے مدرسہ رشید العلوم چترا میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دوران قاضی صاحب سے آپ کا ربط وضبط بڑھا جو ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء کو قاضی صاحب کی رحلت تک اس طرح قائم رہا جیسے دو جان ایک قالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی رفاقت میں امت اسلامیہ ہندیہ کے بڑے بڑے کام لیے۔

۱۹۶۵ء میں قاضی صاحب کے مسلسل اصرار پر آپ نے ناظم امارت شرعیہ کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۱۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو امیر شریعت مولانا رحمانی کی رحلت کے بعد جب مولانا عبد الرحمٰن صاحب امیر شریعت بنے تو آپ کا بحیثیت نائب امیر شریعت انتخاب عمل میں آیا جن کی رحلت کے بعد آپ کو امیر شریعت بہار واڑیسہ منتخب کیا گیا۔ امارت شرعیہ سے یہ تعلق آخری دم تک قائم رہا۔

قاضی اور ناظم کی جوڑی نے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کی زیر سرپرستی امارت شرعیہ کو اعتبار بخشنے اور اسے اوپر اٹھانے کی ان تھک کوششیں کیں۔ ان حضرات کی قربانیوں سے یہ ادارہ ایک کمرہ سے اٹھ کر ملک کا معتبر ترین ادارہ بن گیا۔ اس کی عالیشان عمارت کھڑی ہوئی اور اس کے ماتحت کئی ایک ادارے قائم ہوئے جنھوں نے مسلمانان بہار کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مولانا سید نظام الدین صاحب مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ انہیں سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر آتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ نہایت ہی امانت دار اور دیانت دار تھے۔ جب تک رہے، امارت کی مالیات کا نظام اپنے ہاتھ میں رکھا جس کی وجہ سے چالیس سال پر محیط طویل عرصہ میں مالیات کے کسی تنازعہ نے امارت شرعیہ کو میلا ہونے نہیں دیا۔ قاضی و ناظم میں افہام وتفہیم کی روح کارفرما تھی، لہٰذا ان کے تعلقات میں انا کی خلیج کبھی آڑے نہیں آئی۔ انہوں نے ملت کے مفاد کو ہمیشہ ہر مفاد سے بلند رکھا اور جس ادارے کی بارآوری کے لیے انہوں نے اپنا خون خشک کیا تھا، اس پر آنچ نہ آنے دی۔ ایسی رفاقت کی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی۔

اس کی بات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے آپ لگا سکتے ہیں کہ مولانا سید نظام الدین صاحب کو امارت شرعیہ میں لانے والے قاضی صاحب تھے۔ آپ بھی معاملہ فہمی اور ماہرانہ صلاحیت میں اپنی مثال آپ تھے۔ جب تک زندہ رہے، فقہی گتھیاں سلجھانے میں کم ہی لوگ ان کی برابری کر سکے۔ ایک بڑا حلقہ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کی رحلت کے بعد آپ کو امیر شریعت کے منصب کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتا تھا، لیکن کسی تنازعہ سے بچتے ہوئے ایک بہ نسبت غیر معروف شخصیت کا انتخاب بحیثیت امیر شریعت عمل میں آیا اور مولانا سید نظام الدین صاحب کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب سے ان حضرات کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ امارت شرعیہ کے امور بھی حسب سابق چلتے رہے، کیونکہ عملاً انہی دو حضرات کے ہاتھوں میں امارت شرعیہ کی باگ ڈور تھی۔ پھر یکم نومبر ۱۹۹۸ء کو امیر شریعت پنجم کی رحلت کے بعد آپ کو نیا امیر شریعت منتخب کیا گیا اور قاضی صاحب آپ کے نائب بن گئے۔

۲۸ ؍ڈسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں کل ہند مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد ہوا۔ کنونشن کی تحریک پر ۸ ؍اپریل ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اس کے اولین صدر منتخب ہوئے اور امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے جنرل سکریٹری۔ بورڈ کے روز اول سے آپ نے قاضی صاحب کے ساتھ امیر شریعت کا سایہ بن کر خدمات انجام دیں اور بورڈ کے مقاصد کے حصول اور اسے کامیاب کرنے کے لیے امکان بھر اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کیں۔ لہٰذا امیر شریعت مولانا رحمانی کے انتقال کے بعد آپ کا مئی ۱۹۹۱ء میں بورڈ کا جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ ان چوبیس سالوں کے دوران جو بحران اٹھے، جن مسائل ومشکلات سے امت اسلامیہ ہندیہ دوچار ہوئی، بورڈ کو توڑنے اور کمزور کرنے کی جتنی سازشیں ہوئیں، مولانا نے کمال حکمت اور دانائی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بورڈ کی لڑی کو پروئے رکھنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

مولانا نے کبھی عہدوں کا پیچھا نہیں کیا، عہدے ان کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ۳۱ ؍ڈسمبر ۲۰۰۰ء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی رحلت کے بعد جب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے تو ایک موقع ایسا آیا جب کہ بورڈ کے صدر اور جنرل سکریٹری دونوں کلیدی عہدوں پر امارت شرعیہ کے عہدیدار، امیر شریعت اور نائب امیر منتخب ہوئے۔ چونکہ بورڈ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا آپ کو احساس ہوا کہ ایک ہی حلقے سے کلیدی عہدیداران کا انتخاب بورڈ کی روح کے منافی ہے، لیکن قاضی صاحب کے اصرار اور ممبران کی خواہش پر مولانا اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ۴ ؍اپریل ۲۰۰۲ء میں قاضی صاحب کی رحلت تک چند سال صورت حال یہ رہی کہ امارت شرعیہ میں مولانا امیر شریعت تھے تو قاضی صاحب نائب امیر، اور پرسنل لا بورڈ میں قاضی صاحب صدر تھے تو مولانا جنرل سکریٹری۔ اس طرح معاملات میں شخصیت کے ساتھ منصب کا احترام دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔

مولانا نے قاضی صاحب کے رفاقت میں جن اداروں کے قیام میں حصہ لیا، ان میں نومبر ۱۹۸۸ء میں سجاد اسپتال کا قیام، اپریل ۱۹۸۹ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی کا قیام، مئی ۱۹۹۶ء میں وفاق المدارس کا قیام، اور ۱۹۹۸ء میں المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء کی تاسیس بہت اہم ہے۔ آپ ۱۹۹۶ء سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، اور ۱۹۹۷ء سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مولانا نے جن شخصیات کے ساتھ کام کیا، انہیں اپنا گرویدہ بنایا۔ بورڈ کے موجودہ صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ بھی آپ کی خوب جمی۔ ان دونوں کے رجحانات اور فکری انداز اور تحمل اور برداشت کی قوت نے امت کو بہت سہارا دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کا داغ مفارقت مولانا سید محمد رابع صاحب کے لیے بھی کتنا بڑا ذاتی نقصان ہے۔

مولانا نے عمر طبعی پائی۔ باوجود اس کے آپ کا جدا ہونا ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے جس کی تلافی مشکل ہی سے ہوسکے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں اپنے اخلاق، مروت، صلاحیت، للّٰہیت اور قربانی کے جو چراغ جلائے تھے، ان کی لو کبھی نہ بجھے۔ چراغ سے چراغ جلتے رہیں، اسی میں امت کی بھلائی ہے۔ یہی ان کے درجات بلند سے بلند کرنے کا ذریعہ بھی ہے، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

حالات وواقعات

محمد سلیمان کھوکھر

بہار کا عالم

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ 6 ستمبر 1965ء کی بات ہے۔ اگلے روز 7 ستمبر کو پاکستان کی مایہ ناز ایئر فورس کے پائلٹ ایم، ایم، عالم نے صرف 10 سیکنڈ میں ہندوستان کا لڑاکا طیارہ مار گرایا جبکہ صرف 38 سیکنڈ میں مزید چار طیارے کرگس بنا کر انہیں ہواؤں سے زمین پر پٹخ دیا اور یوں محض 48 سیکنڈوں میں 5 طیارے مار گرانے کا ایسا ریکارڈ قائم کیا کہ ابھی تک سے کوئی توڑ نہیں سکا۔ مستقبل کے حالات تو خدا ہی جانتا ہے۔

کیا مردم خیز علاقہ ہوگا پٹنہ کا جس نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا خطیب اعظم اور امیر شریعت بھی پیدا کیا۔ اس پائے کی خطابت کا ریکارڈ بھی آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔ سوچتا ہوں کہ کیا خطابت ہوگی جسے مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، نواب بہادر یار جنگ اور مولانا ظفر علی خان کا زمانہ ملا مگر وہ سب پر بھاری نکلے۔ مختار مسعود نے درست کہا کہ ''ان کے ہم عصر تو کئی تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔''

ایم ایم عالم سے نہ صرف پاکستانیوں نے ٹوٹ کر محبت کی بلکہ عالم اسلام نے بھی زہرہ و دل میں جگہ دی جب انہوں 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بھی اسرائیل کے دو طیارے مار گرائے اور اسرائیل کی فضاؤں پر بھی حکمرانی کی۔ آج بھی شائد اسرائیلی فضائیہ کے کسی ہیڈ کوارٹر میں ایم ایم عالم کا ذکر ہوتا ہوگا، کیونکہ یہودی اپنے دوست کو تو نہیں دشمن کو ضرور یاد رکھتے ہیں۔ وہ غایت درجہ بلند حوصلہ اور بلا کے دلیر تھے۔ شاید اسی وجہ سے خود اپنی فضائیہ میں ان کے بہت حریف پیدا ہو گئے جو خود تو کچھ نہ کر سکتے تھے ماسوائے اس مرد جری کی مخالفت کے، جنہوں نے اپنے دل میں سوچا اور دعائیں بھی کیں کہ اللہ کرے کہ کسی بھی وقت وہ بنگلہ دیش چلے جائیں، مگر ایم ایم عالم نے بنگلہ دیش ایئر فورس کا سربراہ بننے کی بجائے پاکستان میں زندہ اور یہیں مرنا پسند کیا۔

انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی مگر زندگی میں سب سے کاری اور بھاری ضرب ان کے دل پر دو عورتوں نے لگائی۔ ہوا یوں کہ بیگم ایئر مارشل انور شمیم اور بیگم جنرل شفیقہ ضیاء الحق نے پشاور میں متعین ایئر کموڈور ایم ایم عالم سے کہا کہ پاکستان ایئر فورس کا طیارہ چکلالہ ایئر پورٹ سے کراچی بھیجو جو وہاں سے ہمارے اور ہماری سہیلیوں کے لیے نئے فیشن کے کپڑے، جوتے، پرس، پرفیوم اور سامان ہار سنگھار کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ بیوٹیشنز کو بھی لے کر آئے۔

میدان جنگ میں 48 سیکنڈز میں دشمن کے 5 طیارے مار گرانے والا غیرت مند ایم ایم عالم تو یہ حکم سن کر غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا اور نہایت سختی سے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ایسی منہ چڑھی اور منحوس بیگمات بھلا کہاں نچلا بیٹھنے والی ہوتی ہیں۔ جھٹ ایئر مارشل انور شمیم کو اور انہوں نے آگے ''مرد مومن مرد حق'' ضیاء الحق کو اس نافرمانی سے آگاہ کیا اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ اسے ایک چھوٹی غلطی سمجھ کر نظر انداز کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن کیا کریں، آخر وہ قوم کا ہیرو ہے۔

شاید روزنامہ ''نوائے وقت'' کے قاری ہوں گے جو روزانہ یہ پڑھتے ہیں کہ ''سب سے افضل جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے''۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ضیاء الحق نے اپنے اپنے عزیزوں کو ہر جگہ کلیدی عہدوں پر فائز کرنا شروع کیا تو یہ شیطانی سلسلہ پاکستان ایئر فورس تک دراز ہو گیا جس پر اس مرد جری نے اپنی دونوں آنکھیں ضیاء الحق کی ایک آنکھ میں ڈال کر جابر سلطان کو کہا کہ ''سر! آپ یہ سب کچھ غلط کر رہے ہیں۔ آپ کی وفاداری ملک وقوم کی بجائے اپنی ذات برادری کے لیے ہے''۔ بیگمات والے واقعے کے بعد یہ کلمہ حق ضیاء الحق کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ لہٰذا ایم ایم عالم کو پاکستان ایئر فورس سے ''باعزت'' ریٹائر کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

ایئر مارشل (ر) اصغر خاں جب پاکستان ایئر فورس کے سربراہ بنے تو انہوں نے ایئر فورس میں بھرتی کا مطلوبہ معیار تھوڑا سا نرم کر دیا کیونکہ مشرقی پاکستان کے بنگالی اور بہاری اس پر کم ہی پورا اترتے تھے۔ اس فیصلے کے بعد مشرقی پاکستان سے بہت لوگ ایئر فورس میں شامل ہوئے اور وقت آنے پر اصغر خاں کا فیصلہ درست ثابت کر دیا۔

بڑے اور چھوٹے ذہن کے کمانڈر اور انسان میں کیا فرق ہوتا ہے؟ واقعات تو بہت سے ہیں مگر ایک واقعہ سنانے پر ہی اکتفا کروں گا۔ جب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اور جنرل ایوب خاں کے درمیان 64ء کے اواخر میں انتخابی معرکہ ہوا تو بطور صدارتی امیدوار ایوب خان نے رسالپور اکیڈمی میں ایئر فورس کے جوانوں اور افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اپنا انتخابی پروگرام پیش کیا۔ ان کے خطاب کے بعد ایئر مارشل اصغر خاں نے اپنا طیارہ کراچی بھیجا اور مادر ملت سے درخواست کی کہ آپ ہماری خواہش پر رسالپور اکیڈمی میں انتخابی تقریر فرمائیں کیونکہ یہ صرف ایوب خان کا ہی نہیں، آپ کا بھی حق ہے کہ آپ بھی خطاب فرمائیں اور ہمارا بھی حق ہے آپ کو سنیں۔ جب مادر ملت خطاب کرنے رسالپور پہنچیں تو انہیں مکمل پروٹوکول دیا گیا اور ان کے خطاب کو سننے کے لیے تمام جوانوں اور افسروں کی حاضری کو یقینی بنایا گیا۔ یہاں جنرل ایوب خان کو داد نہ دینا بھی بخیلی ہوگی جنہوں نے اصغر خاں سے کوئی باز پرس نہ کی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ایم ایم عالم پنڈی فوجی (MEXX) کے ایک باتھ روم نما کمرے میں گوشہ نشین سے ہو گئے۔ کتابوں اور سگریٹوں کو جیون ساتھی بنا لیا۔ ملکی حالات پر کڑھتے رہے۔ شیطان بھی بہکاتا ہوگا کہ میاں تم بنگلہ دیش ہی چلے جاتے جہاں تم خود ایئر فورس کے سربراہ ہوتے مگر اندر کا پاکستانی بہت مضبوط ثابت ہوا۔ اللہ کی رضا پر راضی یہ جگر دار و بلند کردار اور دلیر و جری افسر زندگی کے 77 ویں سال میں تھا کہ اللہ نے ایک چھوٹے سے کمرے سے اپنی وسیع وعریض جنت میں بلا لیا۔ قدرت کا فیصلہ بڑا منصفانہ ہوا۔ آج لاہور کے ایم ایم عالم روڈ کے علاوہ پورے ملک میں کئی مقامات ایسے ہیں جو ان کے نام سے موسوم ہیں۔

آرا وافکار

ڈاکٹر محی الدین غازی*

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں-۱۱

(۶۹) سَحَر کا مطلب

سحر رات کے آخری پہر کو کہتے ہیں، امام لغت ازہری کہتا ہے: سحر رات کا ایک ٹکڑا ہے، والسَّحَرُ قِطْعَةٌ مِنَ اللَّيْلِ۔ تہذیب اللغۃ۔ جوہری لکھتا ہے: سحر صبح سے کچھ پہلے کا وقت ہے، والسَّحَرُ: قُبَيْلَ الصُّبحِ۔ الصحاح۔

لسان العرب میں ہے: صبح سے پہلے رات کا آخری حصہ، ایک اور قول ہے کہ رات کے آخری تہائی سے طلوع فجر تک کا وقت۔ والسَّحَرُ وَالسَّحَرُ: آخِرُ اللَّيْلِ قُبَيْلَ الصُّبْحِ، وَالْجَمْعُ أَسْحَارٌ۔۔۔ وَ قِيْلَ: هُوَ مِنْ ثُلُثِ اللَّيْلِ الآخِرِ إِلىٰ طُلُوْعِ الْفَجْرِ۔

چونکہ سحر کا وقت طلوع فجر تک جاتا ہے، اس لئے کبھی کبھی طلوع فجر کے وقت کو بھی اس میں ضمناً شامل کرلیا جاتا ہے، لیکن سحر کا اصل وقت طلوع فجر سے پہلے کا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک جگہ واحد یعنی سحر، اور دو جگہ جمع یعنی اسحار آیا ہے۔ مترجمین کے یہاں اس لفظ کے مختلف ترجمے ملتے ہیں۔

(۱) إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِباً إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ۔ (سورۃ القمر:۳۴)

''بھیجا ہم نے اوپر ان کے مینہ پتھروں کا مگر لوگ لوط کے، نجات دی ہم نے ان کو وقت سحر کے''۔ (شاہ رفیع الدین)

''بھیجی ان پر باؤ پتھراؤ کی سوائے لوط کے گھر کے، ان کو بچا دیا ہم نے پچھلی رات سے''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اور ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا اس پر بھیج دی صرف لوطؑ کے گھر والے اُس سے محفوظ رہے۔ اُن کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال دیا''۔ (سید مودودی)

''بیشک ہم نے ان پر پتھراؤ بھیجا سوائے لوط کے گھر والوں کے، ہم نے انہیں پچھلے پہر بچالیا''۔ (احمد رضا خان)

---

* ہیڈ آف ریسرچ، دارالشریعۃ متحدہ عرب امارات۔ mohiuddin.ghazi@gmail.com

Lo! We sent a storm of stones upon them (all) save the family of Lot, whom We rescued in the last watch of the night (Pickthall)

''ہم نے ان پر سنگ ریزے برسانے والی ہوا مسلط کر دی۔ صرف آل لوط (اس سے بچے)۔ ہم نے ان کو نجات دی سحر کے وقت''۔ (امین احسن اصلاحی)

We sent against them a violent Tornado with showers of stones, (which destroyed them), except Lut's household: them We delivered by early Dawn,-(Yousuf Ali)

''تو ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی مگر لوط کے گھر والے کہ ہم نے ان کو پچھلی رات ہی سے بچا لیا''۔ (فتح محمد جالندھری)

(۲) وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ۔ (سورۃ آل عمران: ۱۷)

''اور بخشش مانگنے والے بیچ پچھلی رات کے''۔ (شاہ رفیع الدین)

''اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات کو''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اور اخیر شب میں اٹھ کر گناہوں کی معافی چاہنے والے''۔ (اشرف علی تھانوی)

''اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں''۔ (سید مودودی)

those who pray for pardon in the watches of the night.(Pickthall)

and implore the forgiveness of Allah before daybreak.(Maududi)

''اور اوقات سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اور اوقات سحر میں گناہوں کی معافی مانگا کرتے ہیں''۔ (فتح محمد جالندھری)

and who pray for forgiveness in the early hours of the morning.(Yousuf Ali)

and the praying ones at early dawn for forgiveness.(Daryabadi)

(۳) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ (سورۃ الذاریات: ۱۸)

''اور وقت صبح کے وہ استغفار کرتے تھے''۔ (شاہ رفیع الدین)

''اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگتے''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اور آخر شب میں استغفار کیا کرتے تھے''۔ (اشرف علی تھانوی)

''پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے''۔ (سید مودودی)

And ere the dawning of each day would seek forgiveness (Pickthall)

And in the hours before dawn, they were (found) asking (Allah) for forgiveness,(Hilali&Khan)

''اورصبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے''۔(امین احسن اصلاحی)

''اورپچھلی رات استغفار کرتے''۔(احمد رضا خان)

''اوراوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے''۔(فتح محمد جالندھری)

مذکورہ بالا تینوں آیتوں کے ترجموں میں رات کا آخری پہر یا رات کی آخری گھڑی سحر کا درست ترجمہ ہے، اسی طرحbefore dawn, , ere the dawning, watches of the night, before daybreak بھی سحر کا صحیح مفہوم ہے۔

جن ترجموں میں صبح کا وقت یاat dawn, early hours of the morning ہے، وہ سحر یا اسحار کا درست ترجمہ نہیں ہے۔ کیونکہ سحر صبح کے وقت کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ صبح سے پہلے کے وقت کو کہتے ہیں۔

اردو زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے سحر یا اسحار کا ترجمہ سحر کا وقت یا اوقات سحر کرنا اس لئے موزوں نہیں ہے کہ اردو میں سحر کا لفظ صبح کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، فرہنگ آصفیہ میں ہے: ''صبح کے پہلے کا وقت، چار گھڑی کا تڑکا، بھور، تڑکا، نور کا تڑکا، صبح دم، تاروں کی چھاؤں، صبح، فجر، روز روشن۔'' اس لئے لفظ سحر سے قاری کو تو اشتباہ ہو ہی سکتا ہے، خود یہ بھی نہیں معلوم ہو پاتا ہے کہ مترجم کے ذہن میں کیا ہے، اسی لئے مذکورہ بالا ترجموں میں دیکھیں کہ صاحب تدبر نے اسحار کا ترجمہ ایک آیت میں سحر کے اوقات اور دوسری آیت میں صبح کے وقتوں کیا ہے۔ علامہ فراہی نے سحر کا مطلب بیان کیا ہے: السَّحَرُ قُبَيْلَ الِاسْفَارِ۔(تفسیر سورۃ الذاریات) ممکن ہے کہ اس سے صاحب تدبر نے صبح کا وقت مراد لیا ہو۔

نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ میں سحر سے مراد رات کا وقت ہے، اس کی تائید سورہ ہود کی حسب ذیل آیت سے ہوتی ہے جس میں حضرت لوط کو رات کے حصے میں نکلنے کا حکم دیا گیا:

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ۔(سورۃ ھود:۸۱)، ''اپنے گھر والوں کے ساتھ کچھ رات رہے نکل جاؤ''۔

مذکورہ بالا بعض ترجموں میں سحر یا اسحار کا ترجمہ پچھلی رات بھی کیا گیا ہے، اردو لغات کے مطابق پچھلی رات سے رات کا دوسرا آخری حصہ مراد ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ ترجمہ درست ہے۔

مذکورہ بالا ترجموں میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض مترجمین جیسے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اسحار کا ترجمہ ایک آیت میں پچھلی رات کیا ہے، تو دوسری آیت میں صبح کے وقت کیا ہے۔

سید مودودی نے آخری آیت میں سحر کا ترجمہ رات کے پچھلے پہروں کیا ہے، جو درست ہے مگر ان کے ترجمے کا درج ذیل انگریزی ترجمہ درست نہیں ہوا۔

and would ask for forgiveness at dawn,(Maududi)

(۷۰) ضمیر کے مرجع کا تعین

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ۔(سورۃ المدثر:۵۶)

اس آیت میں ھو کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یہی رائے عام مفسرین اور مترجمین نے اختیار کی ہے، جیسے:

''اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے وہ اس کا حق دار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے''۔ (سید مودودی)

''اور وہ کیا نصیحت مانیں مگر جب اللہ چاہے، وہی ہے ڈرنے کے لائق اور اسی کی شان ہے مغفرت فرمانا''۔ (احمد رضا خان)

زمخشری کے الفاظ ہیں: هُوَ حَقِيقٌ بِأَنْ يَتَّقِيَه عِبَادُهُ وَ يَخَافُوْا عِقَابَهُ، فَيُؤْمِنُوْا وَيُطِيْعُوْا، وَ حَقِيْقٌ بِأَنْ يَغْفِرَ لَهُمْ إِذَا آمَنُوْا وَأَطَاعُوْا۔

البتہ صاحب تدبر قرآن نے ایک اور رائے اختیار کی، اور ھو کا مرجع فَمَن شَاء ذَكَرَهُ میں لفظ مَن کو یعنی نصیحت اختیار کرنے والوں کو قرار دیا۔

''اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے، مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی اہل تقوی اور وہی سزاوار مغفرت ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

لیکن یہ رائے سیاق کلام سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ آیت میں نصیحت اختیار کرنے والوں کا تذکرہ جمع کے صیغے سے آ گیا ہے، اس کے بعد پھر انہی کے لئے واحد کی ضمیر لانے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں قرین قیاس یہی ہے کہ ھو کی ضمیر کا مرجع اس سے متصل لفظ اللہ کو بنایا جائے۔

علامہ فراہی نے بھی تعلیقات القرآن میں جمہور مفسرین کی رائے کے مطابق رائے ذکر کی ہے: أَنَا أَهْلٌ أَنْ أُتَّقَىٰ، فَمَنْ اتَّقَانِي فَلَمْ يَجْعَلْ مَعِيَ إِلٰهاً غَيْرِي، فَأَنَا أَهْلٌ أَنْ أَغْفِرَ لَهُ۔

(جاری)

مقالاتِ ایوبی

رشحات قلم: مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی

صفحات: ۲۴۶۔ قیمت: ۱۲۵ روپے (رعایتی)

ناشر: الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)

آرا وافکار

محمد سمیع اللہ سعدی*

موجودہ دور کے فکری چیلنجز اور فضلا کی ذمہ داری

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری روز اول سے تا امروز جاری ہے۔حق و باطل کی کشمکش قدیم تاریخ رکھتی ہے۔مختلف میدانوں میں اسلام اور کفر کی جنگ صدیوں سے جاری وساری ہے۔نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی اسلام کی فصیلوں میں دراڑیں ڈالنے کا ابلیسی عمل شروع ہوا جو بلا تعطل کے آج تک جاری ہے۔حق و باطل کی اس طویل کشمکش میں جہاں اہل باطل اور اہل کفر کی ریشہ دوانیوں، سازشوں، نت نئے طریقوں سے حق کو ختم کرنے کی کوششوں، اپنے تمام تر وسائل وساز وسامان کے ساتھ حق کو ملیامیٹ کرنے کی تگ ودو اور عسکری، فکری، علمی، سیاسی، تہذیبی اور دیگر میدانوں میں حق پر حملہ آور ہونے کی داستانوں کی ایک طویل تاریخ ہے، وہاں باطل کے خلاف اہل حق کی کاوشوں، حق پر ڈٹنے اور مر مٹنے کے مبارک جذبوں، غلبہ حق کے لیے جان ومال کی قربانیوں، باطل کے ایوانوں میں گرجدار للکاروں اور ہر میدان میں باطل کو منہ توڑ جواب دینے کی داستانوں کی بھی ایک حسین اور قابل رشک تاریخ ہے۔دعوت وعزیمت کی یہ صبر آزما تاریخ ہمارے لیے مشعل راہ اور مایوس کن حالات میں شمع امید ہے اور دین اسلام کی حفاظت کے خداوندی وعدے کا مظہر اتم ہے۔خلیفہ بلافصل، جانشین پیغمبر اور یار غار ومزار کا الہامی جملہ ''اینقص الدین و انا حی''، رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے سرفروشوں اور دین کے غمخواروں کے لیے دستور، لائحہ عمل اور ماٹو کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر دور میں دین اسلام کے محافظوں نے سنت صدیقی پر عمل کرتے ہوئے دین میں رخنہ ڈالنے والوں کا تعاقب کیا ہے۔

عصر حاضر میں سنت صدیقی دہرانے کی پھر اشد ضرورت ہے۔آج کی دنیا علوم وفنون کی دنیا ہے، سائنس و ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کا دور ہے، فلسفہ وعقلی موشگافیوں کا زمانہ ہے، آزاد خیالی اور نفس پرستی کا دور دورہ ہے، مادیت اور سرمایہ ہی اس دور کے انسان کا معبود اعظم ہے۔انٹرنیٹ اور میڈیا نے دور اور قریب کے فرق کو مٹا دیا ہے۔آج ماضی کے برعکس زیادہ تنوع، وسعت اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ باطل اسلام پر حملہ آور ہے۔مزید براں مسلمان ماضی کی طرح قوت وطاقت میں نہیں ہیں۔خلافت کا سائبان مسلمانوں کے سر پر سایہ فگن نہیں ہے۔آج کی

* استاذ جامعہ فریدیہ، اسلام آباد۔

دنیا کے اختیارات کی باگ ڈور مغرب کے ہاتھ میں ہے اور سیاست، معیشت، سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، فکر، تہذیب، غرض ہر میدان میں مغرب حاکم، امام اور کلی اختیارات کا مالک ہے۔ مغرب نے اپنی حاکمیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام پر چوطرفہ حملہ کر رکھا ہے۔ آج کے مسلمان خصوصاً ایک عالم دین اور فاضل کی ذمہ داری ماضی کے برخلاف کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ امت مسلمہ کی بقاء، تحفظ اور دینی وایمانی حفاظت وارثین انبیاء کے کندھوں پر ہے۔ موجودہ دور کے بڑے چیلنجز سے ہر عالم و فاضل کو باخبر رہنا چاہیے، اور ان کے سد باب اور توڑ کے لیے ہمہ جہت تیاری کرنی چاہیے۔ امت مسلمہ کو علمی وفکری حوالے سے درجہ ذیل بڑے چیلنجز کا سامنا ہے:

۱۔ سیکولرزم

سیکولرزم عصر حاضر کے بڑے اور خطرناک فتنوں میں سرفہرست ہے۔ سیکولرزم کا مطلب دین کی دنیاوی معاملات، معاشرتی امور اور ریاستی مسائل سے علیحدگی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیکولرزم دین کو محض فرد کا ذاتی، پرسنل اور پرائیویٹ معاملہ سمجھتا ہے اور اجتماعی، معاشرتی وریاستی معاملات میں دین و مذہب کی مداخلت کا سختی سے مخالف ہے۔ جبکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور کامل دستور زندگی ہے، انسانی زندگی کا کوئی گوشہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اسلامی شریعت سے باہر نہیں ہے۔ سیکولرزم اسلام کی کاملیت، جامعیت اور ابدیت کے لیے عصر حاضر کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔ آج امت مسلمہ مجموعی طور پر دانستہ یا نادانستہ سیکولرزم سے متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستاون اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی اسلام مکمل طور پر ریاستی سطح پر نافذ نہیں ہے۔ آج کا اسلام صرف چند عبادات تک محدود ہے۔ آج اسلامی معاشروں میں اسلام کے ریاستی و معاشرتی نفاذ کی بات ایک اجنبی اور ناقابل عمل نعرہ بن گیا ہے۔ ان حالات میں امت کے فکری وعلمی رہنماؤں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ عصر حاضر کے سب سے بڑے فتنے کے خلاف علمی ہتھیار اٹھائیں اور اسلام کی جامعیت، کاملیت اور ابدیت کو عصر حاضر کے اسلوب، زبان اور اصطلاحات میں پیش کریں۔

۲۔ الحاد

انسانی معاشروں میں ایسے لوگوں کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے جو مذہب اور خدا کے منکر تھے، لیکن عصر حاضر کی حیرت انگیز مادی ترقی اور سائنسی ایجادات کے بطن سے الحاد کی ایک عالمگیر تحریک نے جنم لیا ہے۔ الحاد روئے زمین پر تمام مذاہب کے انکار کا نام ہے۔ مذہب، دین، خدا، اور ایک برتر ہستی کے مطلق انکار کا نام الحاد ہے۔ ملحدین کے نزدیک مابعد الطبیعیات نام کی دنیا ایک وہم ہے۔ کائنات صرف موجود اور محسوس کا نام ہے۔ غیر محسوس، غیر مرئی، مابعد الطبیعی اور روحانی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ سب انسانی توہمات اور خیالات ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق الحاد معاصر دنیا کا مقبول ترین نظریہ ہے اور روزانہ ہزاروں لوگ الحاد کی بھینٹ چڑھ کر خدا اور مذہب کے مطلق انکار کا نظریہ اپنا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی ایجاد سے تو الحاد کا فتنہ ایک منظم اور مربوط تحریک میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نیٹ پر ملحدین کی بے شمار ویب سائٹس، فورمز اور سوشل میڈیا پر متعدد پیجز اور گروپس موجود ہیں جن میں لاکھوں لوگ شامل

ہیں۔آج کے ملحدین کا سب سے بڑا ٹارگٹ دین اسلام ہے، کیونکہ باقی مذاہب اپنی عبادتگاہوں تک محدود ہیں اور خود ان کے ماننے والوں کے نزدیک وہ معاصر دنیا کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں۔صرف دین اسلام ہی دنیا کا وہ واحد نظریہ اور یکتا دین ہے جو آج بھی انسانیت کے مسائل کا سب سے جامع اور کامل حل پیش کرتا ہے۔الحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہونے کے ناطے ملحدین کی توپوں کا رخ مکمل طور پر اسلام کی طرف ہے اور نت نئے شبہات، اعتراضات اور تاریخ وسیرت سے ضعیف وموضوع روایات وعبارات کی بنیاد پر دین اسلام کو نشانہ بنا رہے ہیں۔آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جدید الحاد کا ایک منظم ومربوط رد پیش کیا جائے۔ملحدین کی دسیسہ کاریوں کے مسکت جوابات دیے جائیں اور ان کے اعتراضات واشکالات کی بنیادوں پر علمی وتحقیقی کام کیا جائے۔ملحدین کے کام کا اگر ایک جائزہ لینا ہے تو نیٹ پر جراءت تحقیق کے نام سے ویب سائٹ، فورم اور فیس بک پیج پر نظر ڈالنے سے اس فتنے کی خطرناکی، ہولناکی اور عالمگیریت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۳۔جدیدیت

مغرب صدیوں سے پادریوں اور کلیسا کی غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔اس جکڑ بندی کے خلاف سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر نے ایک مضبوط تحریک شروع کی جس نے آگے چل کر پروٹسٹنٹ کے نام سے ایک مستقل مکتب کی شکل اختیار کر لی۔اس کے بعد کلیسا و پاپائیت کے خلاف متنوع تحاریک اٹھیں اور ان تحاریک کی کوکھ سے ماڈرن ازم کی ایک ہمہ گیر تحریک نے جنم لیا۔مغرب کے نامی گرامی فلاسفہ نے عقلی وفلسفیانہ بنیادوں پر ماڈرن ازم کی راہ ہموار کی اور زندگی گزارنے کے متعدد فلسفے خالص عقلی بنیادوں پر مغربی دنیا میں وجود میں آئے۔ان تمام فلسفوں کا جامع عنوان ماڈرن ازم ہے جن میں قدر مشترک موجودہ دور کے انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور خودمختاری کا علمبردار بنانا تھا۔یوں جدید مغربی دنیا نے آزادی، مساوات اور ترقی کے تین بنیادی اصولوں پر نظام زندگی کی تشکیل کی جس کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام، لبرل مغربی جمہوریت، انسانی حقوق کا عالمی چارٹر، سوشل سائنسز اور دیگر جدید نظام ہائے زندگی وجود میں آئے۔سرمایے کو اس جدید نظام زندگی کا جزو اعظم اور روح کی حیثیت دی گئی ہے جس سے آگے چل کر دنیا کے وسائل پر ہر قیمت پر قبضہ کرنے اور ہر جائز وناجائز طریقے سے دولت اکٹھا کرنے کی عالمگیر سوچ پیدا ہوئی اور حرص و ہوس کی ایک ہمہ گیر فکر نے جنم لیا۔جدیدیت کے اس فکری طوفان نے مغرب سے آگے نکل کر مشرقی واسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔آج صورتحال یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں جدیدیت اپنے تمام مظاہر وآثار کے ساتھ قائم ہے، اور دنیا کے سب سے کامل وجامع دین کے علمبرداروں نے اسے نظام زندگی کے طور پر مکمل قبول کر لیا ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید مغربی فلسفے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے، اور اس جدید فلسفے کی کوکھ سے پیدا شدہ نظام ہائے زندگی کا ایک بھرپور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

۴۔مابعد جدیدیت

مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت کے ردعمل میں وجود میں آیا۔ جدیدیت کے علمبرداروں نے آزادی، ترقی اور مساوات کی بنیاد پر ایک عالمگیر نظام تشکیل دیا اور جبر، قوت، طاقت، لالچ اور مکر وفریب کے ذریعے پوری دنیا پر جدیدیت کا نظام مسلط کرنے کی کوشش کی۔ جدیدیت کے ماننے والوں کے نزدیک اس وقت جدیدیت کے اصول ایک آفاقی سچائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا کے ہر خطے، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر رنگ ونسل کے لوگوں کو جدیدیت کا نظام اپنانا ہوگا۔ اس ظلم واستبداد کے ردعمل میں مابعد جدیدیت کا نظریہ وفلسفہ وجود میں آیا۔ مابعد جدیدیت کی تعریف ایک فلسفی لیوٹارڈ کے الفاظ میں ''مابعد جدیدیت عظیم بیانیوں پر عدم یقین'' ہے۔ مابعد جدیدیت کے علمبرداروں کے نزدیک اس دنیا میں اصول، نظریات، روایات، اقدار اور سچائی وحقیقت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں آفاقی سچائی اور حقیقت مطلقہ کا کوئی وجود ہے۔ یہ سب چیزیں اضافی ہیں۔ اضافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سچائی، حقیقت اور حق وخیر کا تعلق محض انفرادی پسند وناپسند کے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی سچائی، ہر شخص کا خیر اور ہر شخص کا حق الگ الگ ہے۔ اس لیے آفاقی سچائی کا تصور محض ایک دعویٰ اور دیومالائی داستان ہے۔

مابعد جدیدیت کے فلسفے کا اثر یہ ہے کہ آج کے انسان کی دلچسپی محض اپنے احساسات، جذبات اور عملی مسائل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کے انسان کے نزدیک زندگی کی تمام بحثیں مسئلہ اور حل کا نام ہیں۔ افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی کے مباحث محض نظری ہیں جن کا عملی زندگی کی تشکیل اور مسائل کے حل میں کوئی کردار نہیں ہے۔ آج کے انسان کے نزدیک اصول، نظریات، اقدار، قواعد، ضوابط ماضی کی باتیں ہیں۔ اس لئے بعض مفکرین نے موجودہ دور کو ''عدم نظریہ کا عہد'' کہا ہے۔ مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ جدیدیت میں تو اصول کا مقابلہ اصول سے تھا، دلائل کے مقابلے میں دلائل تھے، جبکہ فلسفہ مابعد جدیدیت سرے سے اصول ودلائل کا ہی منکر ہے۔ جو انسان دلیل ونظریے کے وجود کا ہی منکر ہو، اسے کسی نظریے پر آمادہ کرنا اور کسی مذہب وعقائد پر لانا ایک کٹھن کام ہے۔ جدیدیت زدہ انسان کا مقابلہ تو اسلام کی آفاقیت، افادیت اور اسلامی نظام کو عقلی وفلسفیانہ بنیادوں پر ثابت کرنے پر موقوف ہے، جبکہ مابعد جدیدیت سے متاثر انسان کو قائل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے نظری پہلو کی بجائے اس کے عملی پہلو پر بھرپور توجہ دی جائے، انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اسلامی احکام کے مضبوط اور لاینفک تعلق کو ثابت کیا جائے اور اسلامی احکام پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں انسان کی عملی زندگی کے نقصانات اور اس کے درہم برہم ہونے کی بھرپور وضاحت کی جائے۔ الغرض زعمائے امت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اسلام کو محض ایک نظریہ اور آئیڈیالوجی کے طور پر پیش کرنے کی بجائے اسے ایک عملی اور پریکٹیکل نظام کے طور پر پیش کریں۔

۵۔ تجدد پسندی

سیکولرزم، الحاد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے افکار کی اٹھان مغرب سے ہوئی اور مغرب سے بقیہ دنیا میں پھیل گئے۔ ان فلسفوں نے دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظام کو متاثر کیا۔ اسلامی دنیا میں ایک بڑا طبقہ زندگی ان جدید فلسفوں سے

متاثر ہوا، خصوصاً وہ طبقہ جس نے مغربی تعلیمی اداروں یا اس طرز پر بنی ہوئی مسلم ممالک کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ ان فلسفوں خصوصاً جدیدیت سے تاثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی دنیا کے ایک بڑے طبقے نے دین اسلام کو ان جدید نظریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس میں قطع و برید اور کانٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دین اسلام میں موجود حالات کے مطابق تبدیلی، تغیر اور قطع و برید کلی و جزوی دونوں سطح پر ہوئی۔ دین اسلام میں جزوی یا کلی تبدیلی، ترمیم اور اصلاح کے علمبرداروں کو تجدد پسند اور متجددین کہتے ہیں۔ ان متجددین میں سے کسی نے معجزات و کرامات کے اسلامی تصور کو عہد جدید کے متضاد سمجھا تو اس کا انکار کیا، احادیث کو مطابقت میں رکاوٹ سمجھا تو اس پر ہاتھ صاف کیا، کسی نے اسلامی اصطلاحات پر ہاتھ ڈالا، کسی نے اسلام کے سیاسی نظام میں عہد حاضر کے لبرل سیاسی نظاموں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے فقہ المعاملات میں تغیر کا بیڑا اٹھایا اور سود جیسے قطعی و اجماعی حرمت رکھنے والے حکم کی حلت کا نظریہ پیش کیا۔ کسی مفکر نے اسلام کے نظام عفت و عصمت پر تیشہ چلایا، تو کسی نے اسلام کے عائلی نظام کو نشانہ بنایا۔ کسی نے فقہ الجہاد میں تغیر کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے نظام تزکیہ و احسان کو اپنا ہدف بنایا۔

چونکہ ان ترمیمات و تغیرات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلاف سے مضبوط رشتہ تھا، اس لیے اسلاف کے تذکرے اور علماء پر روایت پسندی کی پھبتی کسی گئی اور ہر ممکن طریقے سے راسخ العلم قدیم علماء کی اہانت، مخالفت اور تمسخر و مذاق اڑانے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ان متجددین نے موجودہ دور میں دنیاوی سطح پر مسلمانوں کے زوال میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلام کی اس تشریح اور اس فہم کو سمجھا جو نسل در نسل، سینہ بسینہ اور طبقہ بہ طبقہ صحابہ کرام کے دور سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ ان متجددین کی مجالس، اقوال اور تصانیف میں مشترک طور پر مغرب کی مدح سرائی، مغربی نظام کی اصلحیت، نافعیت، مسلم دنیا کے مستقبل کے بارے مایوسی، دین اسلام کے متفقہ و اجماعی احکام پر اشکالات، اعتراضات اور اسلامی تاریخ اور اسلاف امت کی تحقیر نظر آئے گی۔ متجددین کی تحریروں و تقریروں میں تجدید، جدت، احیاء، اصلاحات، زمانے کے ساتھ ہم آہنگی، اجتہاد اور اس جیسے الفاظ کی کثرت ہے۔ ان کی نظر میں زوال کا سبب دین کی اصلی شکل و صورت پر اصرار ہے اور جس دن دین میں زمانے کے ساتھ تبدیلی و ترمیم کا راستہ کھل گیا، اس دن سے مسلمان ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر ترقی کی معراج پر پہنچ جائیں گے۔ یا للعجب

متجددین دنیائے اسلام کے ہر خطے اور ہر ملک میں پیدا ہوئے، لیکن برصغیر، ترکی اور مصر کو متجددین کے مراکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ برصغیر میں مرزا ابو طالب خان سے لے کر سر سید احمد خان، قیام پاکستان کے بعد تمنا عمادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے لے کر جاوید احمد غامدی تک متجددین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ترکی میں سلیم ثالث، محمود ثانی، مصطفیٰ کمال اتاترک سے لے کر شیخ احمد آفندی تک متجددین کی ایک لمبی کڑی ہے۔ مصر میں جمال الدین افغانی (موصوف اگرچہ اصلاً مصری نہیں تھے، لیکن چونکہ ان کی فکر کو سب سے زیادہ فروغ مصر میں ملا، اس لیے مصری متجددین میں ان کا تذکرہ کیا)، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا مصری سے لے کر مصر کے نامور ادباء تک ایک وسیع سلسلہ ہے۔ عالم اسلام کے

مختلف خطوں کے متجددین کے افکار اور کام سے واقفیت کے لیے جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف کے سربراہ، جدیدیت وتجدد کی تردید میں قابل رشک مقالات لکھنے والے اور مغربی فکر وفلسفہ کے نبض شناس محترم خالد جامعی صاحب کا ایک طویل مقالہ ''عالم اسلام، معرکہ ایمان ومادیت، جدیدیت وروایت قرن اول سے عصر حاضر تک'' مفید رہے گا جو جامعہ کراچی سے نکلنے والے تحقیقی رسالے ''جریدہ'' کے پینتیسویں شمارے میں مکمل شائع ہو چکا ہے۔

فضلاء کی ذمہ داری

عصر حاضر کے ان بڑے فکری چیلنجز کا مقابلہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ علمائے امت چونکہ حدیث کے مطابق انبیاء کے وارث ہیں، اس لیے ان کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمارے فضلاء کو پانچ میدانوں میں ان تھک محنت کی ضرورت ہے:

۱۔ اسلامی علوم میں کامل رسوخ ومہارت

آج کے فضلاء کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی علوم میں مکمل مہارت اور کامل استعداد سے تہی دامن ہوتے ہیں جس کی بنا پر عصر حاضر کے فکری مسائل کا کما حقہ رد نہیں کر سکتے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ اور دیگر علوم الیہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعداد پیدا کی جائے۔ اسلامی علوم پر مکمل گرفت ہی عہد حاضر کے پیدا کردہ اشکالات واعتراضات کے قابل اطمینان حل کا ذریعہ ہے۔ اس کے لیے جہاں نصاب میں قابل ذکر تبدیلیوں کی ضرورت ہے (جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) وہاں مدارس میں ایسی فضاء بنانی چاہیے جس میں طلباء کو نصابی کتب سے ہٹ کر دیگر مراجع تک رسائی ہو، اور خارجی مطالعے کا ایک حوصلہ افزا ماحول میسر ہو۔

۲۔ فرق وافکار کی تاریخ کا مطالعہ

اسلامی تاریخ میں پیدا ہونے والے مختلف فرقے اور متنوع افکار کے حاملین افراد وگروہوں کی تاریخ کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ خصوصاً ان فرقوں کے رد کے لیے اسلاف امت کے مختلف مناہج، طریقہ کار اور طرز تردید کا ایک مبسوط مطالعہ کرنا چاہیے۔ فتنوں کے تعاقب میں اسلاف امت کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے فہم واجتہاد کی بنا پر مختلف طرز اپنائے۔ محدثین کا منہج الگ تھا، متکلمین کا طرز اور تھا، صوفیا کا طریقہ کار الگ تھا۔ پھر ان کے اندر قابل قدر شخصیات کے اسالیب مختلف تھے۔ ان سب سے باخبر رہنا ضروری ہے تاکہ موجود فتن میں مفید حل کی طرف رہنمائی مل جائے۔

۳۔ مغربی فکر وفلسفہ سے واقفیت

عصر حاضر کی جملہ فکری گمراہیوں کا شجرہ نسب کسی نہ کسی صورت میں مغربی فکر وفلسفہ سے ملتا ہے، اس لیے مغرب کا تحقیقی مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مغربی افکار کی تاریخ، ارتقاء اور ان میں حالات واسباب کی بنا پر

متنوع تبدیلیوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ خصوصاً مارٹن لوتھر کی تحریک کے بعد مغربی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی چار سو سالہ تاریخ اور مغربی فلسفے کے مختلف مناہج کا مطالعہ موجودہ فکری چیلنجز سے نمٹنے میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ مغرب سے ناواقفیت بسا اوقات فکری مسائل کو حل کرنے کی بجائے مزید الجھا دیتی ہے۔

۴۔ عالم اسلام کی احیائی وفکری تحریکات کا مطالعہ

تقریباً پچھلے پانچ سو سال سے عالم اسلام روبہ زوال ہے اور مغرب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں عالم اسلام کے مختلف خطوں میں متعدد فکری واحیائی تحریکیں اٹھیں جن کا مقصد امت مسلمہ کو ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلانا تھا۔ ان تحریکوں کا ایک مبسوط مطالعہ ضروری ہے۔ ان کے بانیوں کے حالات، تحریکوں کے مد وجزر، نشیب وفراز اور ناکامی یا کامیابی پر منتج ہونے کی وجوہات سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ موجودہ فکری چیلنجز سے نمٹنے میں ان غلطیوں سے بچنا آسان ہو جائے اور وہی غلطیاں دوبارہ نہ دہرائی جائیں جن کی وجہ سے کئی سو سال سے ہماری فکری وعلمی تحریکیں ناکام ہوتی آرہی ہیں۔

۵۔ عصر حاضر کے اسالیب تحریر وتقریر اور جدید علوم سے بقدر ضرورت سے واقفیت

آج عمومی طور ہمارے فضلا کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تقریر وتحریر کے جدید اسالیب سے نابلد ہیں۔ آج کے محاورے، زبان، اصطلاحات اور جدید نسل کی علمی وذہنی سطح کے مطابق دین اسلام کے ابلاغ وتفہیم سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کمپیوٹر وٹیکنالوجی سے مانوس نسل جب خطباء کے سامنے بیٹھتی ہے تو ان کی زبان سمجھ آتی ہے نہ ان کے طرز و اسلوب سے مانوس ہوتے ہیں جس سے دوری میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ جدید علوم خصوصاً جدید علم سیاست، معیشت اور سوشل سائنسز کا بقدر ضرورت مطالعہ کرنا چاہیے، کیونکہ ان جدید علوم سے بے خبری بسا اوقات جدید نسل کے مسائل اور معاصر فکری آرا کو سمجھنے میں غلطی کا باعث بنتی ہے، اس کے لیے اصحاب مدارس اور دین اسلام کا درد رکھنے والے مخلص جدید تعلیم یافتہ حضرات کو مل کر ایک عام فہم نصاب بنانا چاہیے جن سے ان علوم وافکار کے مبادیات سے بقدر ضرورت واقفیت میں مدد ملے اور وہ مزید مطالعہ وتحقیق کے بل بوتے پر ان علوم میں مہارت اور گہرائی پیدا کرنے پر قادر ہوں۔

آرا وافکار

غازی عبدالرحمٰن قاسمی *

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ کا منہج واسلوب(۱)

تعارف:

اس کائنات کی رنگ وبو میں بہت سے افراد واشخاص پیدا ہوئے اور اپنی مقررہ زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کی وفات کے بعد ان کا ذکر کچھ عرصہ ہوا اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ان کے تذکرے ختم ہوگئے، مگر کچھ ہستیاں اور شخصیات ایسی بھی گزری ہیں جن کی علمی کاوشوں، مجتہدانہ صلاحیتوں اور بلند پایہ استنباط واستدلال سے مزین کتب کی بدولت وہ آج بھی اہل علم کے حلقہ میں زندہ ہیں۔ ان کے بیان کردہ تحقیقی مضامین اسلامیات کے محقق کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں نمایاں نام مجدد الملت، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے۔ آپ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو جو اطراف عالم میں شہرت عطا فرمائی اس کی ایک اہم وجہ آپؒ کی علمی جلالت ہے۔

آپ کی تحریروں میں اتقان وثقاہت اور تحقیقی وعلمی نکات پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ عوام الناس کی خیر خواہی، ان کی دینی اصلاح اور روحانی واخلاقی تربیت کا سامان بھی ملتا ہے۔ آپ اپنے زمانہ کے بہترین عالم ومعلم تھے اور اتباع نبوی ﷺ کے جذبہ سے سرشار تھے۔ شب وروز دین متین کی تبلیغ کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ بلا شک وشبہ آپ اپنے وقت کے مجدد اعظم، مصلح اعلی اور حکیم دانا تھے۔ جو نہ صرف شریعت کے رمز شناس تھے بلکہ اپنے زمانہ کی عوام کے بھی نبض شناس تھے۔ آپ کے علمی وعملی کمالات کے اتنے گوشے ہیں کہ ہر ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے۔ شریعت اسلامیہ کی خدمت اور عوام الناس کی بہبود واصلاح کے لیے آپؒ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور نہایت قیمتی وتحقیقی تصانیف بطور یادگار کے چھوڑیں۔ جن میں سے شہرہ آفاق اور معرکۃ الآرا تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔ اس کتاب میں آپؒ کا منہج واسلوب کیا تھا۔؟ اس پر تفصیلی بحث مابعد السطور میں آرہی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کا موضوع اور مضامین:

''حجۃ اللہ البالغہ'' کا بنیادی موضوع احکام شریعت کی مصالح وحکمتیں اور ان کے اسرار ہیں۔

* لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج ملتان، پاکستان

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فنی لحاظ سے آپ نے متعدد مضامین کو بیان کیا ہے جن میں تعلیمات ربانی، عقائد، احادیث، فقہ، اصول فقہ، عبادات و معاملات، اخلاقیات، تمدن وتہذیب، سیاسیات، کسب معیشت کے طریقے، تدبیر منزل، خلافت وقضا، جہاد، آداب صحبت، معاشرت، فتن، حوادث مابعد، اور علامات قیامت وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اورا ن مختلف موضوعات وابواب کے اسرار ومقاصد اس طرح بیان کیے ہیں کہ ان مسائل کا تعلق انسانی زندگی سے مربوط نظر آتا ہے۔ اوراحکام شرعیہ کی حکمتیں اوراسرار وبھید عقلی ونقلی دلائل سے بیان کیے ہیں۔

یہ کتاب دو بڑے حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ اوامر ونواہی کے مفید اصولوں پر محیط ہے اوراس میں سات مباحث ہیں اوران میں بھی ہر بحث متعدد ابواب میں بیان ہوئی ہے۔ اور دوسرے حصہ میں اسلامی احکام کی عقلا تعبیر وتشریح کی گئی ہے جن میں پیش نظر فقہی موضوعات کی ترتیب ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی خصوصیات:

شاہ صاحبؒ کی یہ عظیم الشان تصنیف اپنے موضوع پر جدت اور ندرت کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ اس کے صرف ادبی اسلوب کو اگر زیر بحث لایا جائے تو اس پر مستقل ایک مقالہ کی ضرورت ہے۔ اور جن دلائل وبراہین سے آپ نے استدلال کیا ہے اگر صرف اس استنباط واستدلال پر غور وفکر کیا جائے تو یہ بھی بڑے اعلی درجے کا کام ہوگا۔ اور دینی واسلامی فکر کو جس انداز میں آپ نے پیش کیا ہے اگر اس پر بات کی جائے تو آپؒ کا یہ ایسا کارنامہ ہے جو آپؒ کو عالم اسلام کی ان شخصیات میں شامل کرتا ہے جن پر تاریخ اسلام کو فخر ہے۔

جب سے یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی ہے ہر دور میں اس کی درس وتدریس کے سلسلے جاری رہے اوراس سے راہنمائی حاصل کی جاتی رہی۔ جو عربی زبان وادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے نہ صرف ذوق تسکین کا باعث ہے بلکہ اہل علم کے لیے بھی ایک ایسی دوا ہے جو فکری اور عقلی راستوں میں شکوک وشبہات کے زہریلے کانٹوں بھرے میدانوں سے گزرتے وقت تریاق کا باعث ہے۔ تشنگان علوم اسلامیہ کے لیے ایک ایسا جام ہے جو ایک دفعہ اس کا ذائقہ چکھ لیتا ہے وہ اس کی حلاوت سے مخمور نظر آتا ہے۔

اسلوب کتاب:

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اک نیا اسلوب اور منفرد طرز تحریر سامنے آیا ہے، جو جامعیت، زور بیان، تحکم واعتماد اور فصاحت وبلاغت کا شاہ کار ہے۔ جس میں انشاء کا ایک خاص انداز ہے جو پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ مختصر اور جامع کلمات کے استعمال کے ساتھ ایسی خوبصورت تراکیب ومحاورات اور استعارات وتشبیہات اور تمثیلات سے کام لیا گیا ہے جن میں اک خاص توازن واعتدال ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے شاہ صاحبؒ کا جو منہج واسلوب بیان سامنے آتا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ متعدد مقامات پر بصیغہ امر استعمال کرتے ہوئے ''اِعْلَم'' (جان لیجئے) سے بات شروع کرتے ہیں۔ ۲۰۰ سو

سے زائد مقامات پر ''اِعْلَم'' کولائے ہیں۔جس کا مقصد مخاطب کو متوجہ کر کے اہم فوائد ونکات بیان کرنا ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں تحقیق کرنے والے محقق کو نگران مقالہ کی طرف سے یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ مقالہ لکھنے سے پہلے اپنا میدان منتخب کرے، کہ کس شعبہ میں اسے مناسبت ہے اور وہ زیادہ بہتر کام کرسکتا ہے۔اسی کے مطابق وہ موضوع کا انتخاب کرے اور مسائل کو زیر بحث لاتے ہوئے مقالہ تحریر کرے۔یہی بات شاہ صاحب نے اپنے خاص انداز اِعْلَم (جان لیجئے) سے شروع کی ہے۔لکھتے ہیں:

فاعلم ان لکل فن خاصة ولکل موطن مقتضی فکما انه لیس لصاحب غریب الحدیث ان یبحث عن صحة الحدیث وضعفه ولا لحافظ الحدیث ان یتکلم فی الفروع الفقهیه وایثار بعضها علی بعض فکذالک لیس للباحث عن اسرار الحدیث ان یتکلم بشئی من ذلک انما غایة همته ومطمح بصره هو کشف السر الذی قصده النبی ﷺ فیما قال سواه بقی هذاالحکم محکما او صار منسوخا او عارضه دلیل آخر فوجب فی نظر الفقیه کونه مرجوحا نعم لا محیص لکل خائض فی فن ان یعتصم باحق ما هنالک بالنسبة الی ذالک الفن (۱)

''جان لیجئے ہر فن کی ایک خاصیت اور ہر جگہ کا کوئی مقتضی ہوتا ہے۔پس جس طرح یہ بات کہ فن غریب الحدیث کے مصنف کے لیے مناسب نہیں کہ وہ حدیث کی صحت وضعف کو زیر بحث لائے، اور نہ حافظ الحدیث کے لیے مناسب ہے کہ وہ فقہی مسائل کے بارے میں اور بعض احادیث کو بعض پر ترجیح دینے کے لیے کلام کرے، پس اسی طرح حدیث کے اسرار سے بحث کرنے والے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کے بارے میں کلام کرے، اس کی پوری توجہ اور اس کے پیش نظر اس راز کو ہی کھولنا چاہیے جس کا نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد میں قصد فرمایا ہے۔عام ازیں وہ وہ حکم محکم باقی ہو، یا منسوخ ہوگیا ہو، یا اس کے معارض کوئی اور دلیل آ گئی ہو جس کی وجہ سے مجتہد کی نظر میں وہ روایت مرجوح قرار پائی ہو البتہ یہ ضروری ہے کسی بھی فن میں داخل ہونے والے کے لیے کہ وہ اس چیز کو پکڑے جو اس فن میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔''

شاہ صاحب نے ایک بہت اہم فائدہ بیان کیا ہے کہ ہر فن کی ایک خاصیت ہوتی ہے اور ہر مقام کا اپنا تقاضا ہوتا ہے۔اسی کے مطابق مسائل کو زیر بحث لانا چاہیے۔یعنی محدث کا کام ہے احادیث بیان کرنا اگر وہ فقیہ نہیں ہے اور فتوی نویسی کے فرائض سرانجام دینا شروع کر دے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں ہوگا۔اور اسی طرح فقیہ کا کام مسائل کا استخراج اور احکام کا استنباط ہے وہ اپنا کام چھوڑ کر غریب الحدیث پر توجہ شروع کر دے تو اس کا بھی فائدہ نہیں ہوگا۔علی ہذا القیاس احکام اسلام کی مصالح اور حکمتیں بیان کرنے والے کو بھی اپنے موضوع پر توجہ کرنی چاہیے۔اور اسی طرح اگر کوئی کسی فن پر کام کر رہا ہو اور دوسرے فن کی طرف مراجعت کی نوبت آئے تو اس فن کی قابل اعتماد اور راجح باتوں کو اختیار کرنا

چاہیے۔مثلاً فقہ پر کام کرتے ہوئے حدیث نقل کرنی ہے تو ان احادیث کا انتخاب کیا جائے جو صحیح اور قابل اعتماد ہیں۔

۲۔ شاہ صاحب کئی مقامات پر صیغہ متکلم استعمال کرتے ہوئے ''اَقُـــولُ ''(میں کہتا ہوں) سے کلام کرتے ہیں۔اور ۲۷۵ سے زائد مقامات پر اس کو لائے ہیں جس کے متعدد مقاصد ہو سکتے ہیں تاہم چند مقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ آیات قرآنیہ کی تفسیر۔

۲۔ احادیث کی تشریح۔

۳۔ آیات میں مطابقت۔

۴۔ فقہی مسالک کے درمیان قرب پیدا کرنا۔

آیت قرآنیہ کی تفسیر کی مثال:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ﴾ (۲)

''وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہہ ہیں۔''

شاہ صاحب اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقول الظاهر ان المحكم مالم يحتمل الا وجها واحد مثل:﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ﴾ (۳) والمتشابه ما احتمل وجوها وانما المراد بعضها كقوله تعالى:﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت﴾ (۴)حملها الزائعون على اباحة الخمر ما لم يكن يعنى او افساد فى الارض والصحيح حملها على شاربها قبل التحريم (۵)

''میں کہتا ہوں آیت کے ظاہر اور واضح معنی یہ ہیں کہ محکم آیت وہ ہے جس کے اندر صرف ایک ہی وجہ کا احتمال ہو۔مثلاً 'حرام کر دی گئیں تم پر تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں'۔اور متشابہہ آیت وہ ہے جس میں چند وجوہ کا احتمال ہو اور مقصود و مراد ان میں سے بعض وجوہ ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا 'جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکیں جب کہ انہوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کئے'۔اس آیت سے بعض کج فہموں نے خمر و شراب کی اتنی مقدار مباح کر دی جو زمین میں فساد اور شر و فتنہ کے درجہ کو نہ پہنچے اور صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے حق میں ہے جو خمر و شراب کی حرمت

سے پہلے شراب پیا کرتے تھے ۔''

شاہ صاحب نے ''اَ قُـولُ'' سے بات کا آغاز کیا اور محکم ومتشابہ کی مع مثال وضاحت فرمائی اور ساتھ ہی ان لوگوں کی غلطی پر متنبہ کیا جنہوں نے آیت سے غلط مفہوم نکالا۔

دوسری مثال:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَــًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ (۶)

''اور جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا تو ایک مومن غلام آزاد کرے۔''

شاہ صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اقول انما وجب في الكفارة تحرير رقبة مومنة او اطعام ستين مسكينا ليكون طاعة مكفرة له فيما بينه وبين الله فان الدية مزجرة تورث فيه الندم بحسب تضييق الناس عليه والكفارة فيما بينه وبين الله تعالى (۷)

''میں کہتا ہوں اس قتل کے کفارہ میں مومن غلام آزاد کرنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس لیے واجب کیا گیا تا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان یہ طاعت اس کے لیے گناہ مٹانے والی عبادت بن جائے، بے شک دیت زجر کا ذریعہ ہے وہ اس پر ندامت پیدا کرتی ہے لوگوں کی تنگی کے اعتبار سے اور کفارہ اس کے اور اللہ کے درمیان ندامت پیدا کرتا ہے۔''

شاہ صاحب کے مذکورہ کلام سے معلوم ہوا کہ شریعت نے قتل خطا میں مومن غلام کا آزاد کرنا یا دو ماہ کے روزے رکھنا بطور کفارہ اس لیے مقرر کیا تا کہ اس نیکی سے اس کا گناہ مٹ جائے، کفارہ بندے اور اللہ کے درمیان ندامت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اور دیت اس لیے واجب کی کہ اس کا ادا کرنا عاقلہ کے ذمہ ہوتا ہے اور وہ اس کے ساتھ خوب ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ کریں گے کہ تمہاری وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ اس سے اسے شدید ندامت کا سامنا ہوتا ہے اور وہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔

واضح رہے کہ شاہ صاحب نے قتل خطا کے کفارہ میں جو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ ان سے تسامح ہوا ہے اس لیے کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۹۲ میں صرف اتنا ہے کہ مومن غلام آزاد کرے یا ساٹھ روزے رکھے۔

حدیث کی تشریح کی مثال:

حضور ﷺ کا ارشاد عالی ہے:

مَـنْ تَـعَـلَّـمَ عِـلْـمًـا مِـمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِي رِيحَهَا (۸)

''جس شخص نے وہ علم کہ جس سے اللہ تبارک تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے اس لیے سیکھا کہ اس کے ذریعہ اسے دنیا کا کچھ مال ومتاع مل جائے تو ایسا شخص جنت کی خوشبو کو بھی نہیں پا سکے گا قیامت کے دن، یعنی جنت کی ہوا۔''

شاہ صاحب اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقول یحرم طلب العلم الدینی لاجل الدنیا ویحرم تعلیم من یری فیه الغرض الفاسد لوجوه :منها ان مثله لا یخلوغالبا من تحریف الدین الدنیا بتاویل ضعیف فوجب سد الذریعة ومنها ترک حرمة القرآن والسنن وعدم الاکتراث بها (۹)

''میں کہتا ہوں دنیا کے لیے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے۔اوراس شخص کو سکھانا بھی حرام ہے جو فاسد غرض رکھتا ہے۔اوران میں سے یہ کہ اس طرح کا آدمی عام طور پر دنیا کمانے کے لیے کمزور تاویلات کے ذریعے دین کی تحریف سے باز نہیں آتا، پس اس راستہ کا بند کرنا ضروری ہوا۔اوران حرمت کے اسباب میں سے دوسرا یہ کہ ایسے شخص کو تعلیم دینا قرآن وسنت کا احترام نہ رکھنا ہے اوران کی پرواہ نہ کرنا ہے۔''

معلوم ہوا حصول دنیا کے لیے دینی علم حاصل کرنا حرام ہے اس لیے کہ ایسا شخص اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے باطل تاویلوں کا سہارا لے گا۔اور ایسے شخص کو تعلیم دینا قرآن وسنت کے احترام میں کمی کا باعث ہے۔

دوسری مثال:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ کَتَمَهُ اُلْجِمَ یَوْمَ القِیَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ (۱۰)

''جس شخص سے ایسا سوال کیا گیا جس کو وہ جانتا ہے اوراس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔''

شاہ صاحب اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقول یحرم کتم العلم عند الحاجة الیه لانه اصل التهاون وسبب نسیان الشرائع واجزیة المعاد تبنی علی المناسبات فلما کان الاثم کف لسانه عن النطق جوزی بشبح الکف وهو اللجام من نار (۱۱)

''میں کہتا ہوں ضرورت کے وقت علم چھپانا حرام ہے۔اس لیے کہ وہ لاپروائی اور سستی کی جڑ ہے اوراحکام شرعیہ کو بھولنے کا سبب ہے اوراخروی جزائیں مناسبتوں پر مبنی ہیں۔پس جب بولنے سے زبان کو روکنا گناہ تھا تو وہ سزا دیا گیا روکنے کی شکل وصورت کے ذریعے اور وہ آگ کی لگام ہے۔''

شاہ صاحب کی اس تشریح سے تین اہم باتیں معلوم ہوئیں۔

(الف) علم چھپانا دین کی اشاعت سے لاپروائی برتنا ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت حال میں لوگ علم حاصل کرنا چھوڑ دیں گے۔

(ب) باتیں دہرانے سے یاد رہتی ہیں جب علم کو چھپایا جائے گا، خرچ نہیں کیا جائے گا تو وہ رفتہ رفتہ بھول جائے گا۔ احکام شرعیہ کو بھلانا نقصان عظیم کا باعث ہے۔

(ج) اخروی جزاوں کے بارے میں ضابطہ بیان کیا ہے کہ وہ عمل کی جنس سے ہوتی ہیں یعنی عمل اور اس کی جزا میں مناسبت ہوتی ہے۔ چونکہ اس نے علم بیان کرنے کی بجائے زبان کو روکا اور منہ بند کیا ہے۔ جو کہ شریعت کی نظر میں گناہ ہے اس لیے آخرت میں اسی کی شکل وصورت میں بدلہ دیا جائے گا اور وہ یہی ہے کہ اس کے منہ پر آگ کی لگام چڑھائی جائے جس سے اس کا منہ بند ہوگا۔

قرآنی آیات میں مطابقت کی مثال:

قرآن کریم میں عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ﴾ (۱۲)

''اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے اوپر چادریں لٹکایا کریں۔ اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر ستائی نہ جائیں گی۔''

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ﴾ (۱۳)

''جب تم ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔''

اور سورۃ النور میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ ﴾ (۱۴)

''ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھا کریں۔''

اس آیت میں مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں، اگر عورتوں کے لیے پردہ اور حجاب کا حکم ہے تو پھر نگاہیں نیچی رکھنے کا کیا مطلب؟

چنانچہ آیات کے درمیان موافقت پیدا کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اقول:....واذاامر الشارع احد بشئی اقتضی ذلک ان یومر الاخر ان یفعل معه حسب ذالک ،فلما امرت النساء بالتستر وجب ان یرغب الرجال فی غض البصر، وایضا فتهذیب نفوس الرجال لا یتحقق الا بغض الابصار ومواخدة انفسهم (۱۵)

''اور جب شارع کسی کو کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ حکم تقاضا کرتا ہے کہ دوسرے کو بھی حکم دیا جائے کہ وہ اس کے ساتھ اس حکم کے موافق معاملہ کرے پس جب عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ضروری ہوا کہ مردوں کو ترغیب دی جائے نظریں نیچی رکھنے کی اور نیز مردوں کے نفوس کا سنورنا متحقق نہیں ہوتا مگر نظریں جھکانے سے اور اپنے نفوس کو پکڑنے سے اس چیز کے ساتھ۔''

شاہ صاحبؒ نے شریعت اسلامیہ کا ایک بہت اہم اصول بیان کیا ہے۔ جب کسی معاملہ کا تعلق دو افراد سے ہو اور شریعت اسلامیہ جب ایک شخص کو کسی بات کا حکم دیتی ہے تو اس حکم کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ دوسرے فرد کو بھی ویسا حکم دیا جائے تاکہ وہ پہلے فرد کو دیے گئے حکم کے موافق عمل کرے۔ جب عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مردوں سے پردہ کریں تو ساتھ ہی مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ نیز مردوں کے اپنے نفس کی تہذیب کا بھی اسی پر انحصار ہے کہ وہ عورتوں کو بلاوجہ نہ دیکھیں اور غض بصر کی پابندی کریں۔ اور اپنے نفوس سے مواخذہ و باز پرس کریں۔

اور اس قسم کی اور مثالیں بھی شریعت اسلامیہ میں موجود ہیں۔ جیسا کہ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا نکاح خود نہ کریں اولیاء کی وساطت سے تمام امور سرانجام ہونے چاہییں تو ساتھ ہی اولیاء کو بھی حکم دیدیا کہ عورتوں کی پسند و ناپسند اور رضامندی معلوم کیے بغیر ان کا نکاح نہ کریں۔ جیسا کہ آگے بحث آرہی ہے۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مردوں کے حقوق بیان کیے تو ساتھ ہی عورتوں کے حقوق بیان کیے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

اَلا اِنَّ لَکُمْ عَلَی نِسَائِکُمْ حَقًّا، وَلِنِسَائِکُمْ عَلَیْکُمْ حَقًّا، فَاَمَّا حَقُّکُمْ عَلَی نِسَائِکُمْ فَلَا یُوطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَھُونَ وَلَا یَاْذَنَّ فِی بُیُوتِکُمْ لِمَنْ تَکْرَھُونَ اَلَا وَحَقُّھُنَّ عَلَیْکُمْ اَنْ تُحْسِنُوا اِلَیْھِنَّ فِی کِسْوَتِھِنَّ وَ طَعَامِھِنَّ (۱۶)

''جان لو کہ تمہارا تمہاری بیویوں پر اور ان کا تم پر حق ہے تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر ان لوگوں کو نہ بٹھائیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو بلکہ ایسے لوگوں کو گھر میں داخل نہ ہونے دیں اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم انہیں بہترین کھانا اور بہترین لباس دو۔''

فقہی مسالک کے درمیان تقریب کی مثال:

فقہاء کے درمیان یہ مسئلہ بڑی شد و مد سے زیر بحث رہا ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر عاقلہ و بالغہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں حنفیہ کا موقف یہ ہے کہ عاقلہ و بالغہ عورت ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کفو میں کر سکتی ہے۔ (۱۷) امام مالکؒ کے نزدیک اس قسم کا نکاح جو ولی کی اجازت کے بغیر کیا جائے وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا۔ (۱۸) اور دیگر جمہور فقہاء کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوگا تاہم اگر کسی عورت نے ایسا کر لیا تو وہ ولی کی

اجازت پر موقوف ہوگا۔اگر اس نے اجازت دیدی تو نکاح صحیح ہوگا وگرنہ جائز نہ ہوگا۔(۱۹)

حنفیہ کے موقف سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر عاقلہ و بالغہ عورت اپنا نکاح کر سکتی ہے۔جبکہ جمہور فقہاء کے مؤقف سے معلوم ہوا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوگا۔احناف اور جمہور کے موقف میں بہت فاصلہ ہے۔فقہاء کرام کی مذکورہ بالا بحث کے بعد اب شاہ صاحب کی کلام کو مدنظر رکھا جائے تو احناف اور جمہور فقہاء کی رائے میں فاصلہ کم ہوتا نظر آئے گا۔جیسا کہ یہ بات پیچھے گزر گئی ہے کہ شاہ صاحب جب کوئی اہم بات یا فائدہ بیان کرتے ہیں تو ''اِعْلَم'' سے بات شروع کرتے ہیں۔چنانچہ اس معرکۃ الاراء مسئلہ میں'' لانکاح الابولی'' کے تحت لکھتے ہیں:

اعلم انه لایجوز ان یحکم فی النکاح النساء خاصة لنقصان عقلهن وسوء فکرهن فکثیرا مالا یهتدین المصلحة ولعدم حمایة الحسب منهن غالبا، فربما رغبن فی غیر الکفء وفی ذلک عار علی قومها ،فوجب ان یجعل للاولیاء شیئی من هذا الباب لتسدالمفسدة(۲۰)

''جان لیجئے نکاح میں صرف فیصلہ کرنے کا اختیار عورتوں کو دیدیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔اس لیے کہ ان کی عقل ناقص اور سوچ ادھوری ہوتی ہے۔کئی مرتبہ ان کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے لیے کونسا قدم اٹھانا بہتر ہے۔اور عام طور پر ان خاندانی خصوصیات کا لحاظ بھی نہیں کرتیں جو خاندانوں میں اہم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کبھی غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہیں جو ان کے خاندان کے لیے شرمندگی بنتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ یہ تمام معاملات اولیاء کے ہاتھوں سرانجام ہوں تا کہ ہر قسم کی خرابی اور فساد سے بچا جا سکے۔''

آگے شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''اور عام طور پر فطرت کی طرف سے لوگوں میں رائج طریقہ یہی ہے کہ مرد عورتوں کے ذمہ دار ہوں،اور ان کے ہاتھ میں ہی معاملات کو کھولنا اور لپیٹنا ہو،ان کے ذمہ مصارف ہوں،اور عورتوں کے نکاح میں اولیاء کا ہونا مردوں کی شان بڑھاتا ہے اور عورتوں کا خود نکاح کرنا بے شرمی کی بات ہے جس کا سبب حیاء کی کمی ہے اور اس میں اولیاء کی حق تلفی ہوتی ہے جو ان کی بے قدری کا باعث ہے۔اور اہم بات یہ ہے کہ نکاح کی تشہیر بھی ضروری ہے تا کہ نکاح اور بدکاری میں فرق ہو جائے اور شہرت کا بہترین طریقہ ہے کہ اولیاء کو نکاح میں شامل کیا جائے۔''(۲۱)

آخر میں شاہ صاحب نے ایک اور اہم بات کی طرف اپنے مخصوص انداز ''اَقُولُ '' کے ساتھ مخاطب کیا ہے:

اقول لایجوز ایضا ان یحکم الاولیاء فقط لانهم لایعرفون ما تعرف المراة من نفسها ولان حار العقد وقاره راجعان الیها والاستئمار طلب ان تکون هی الآمرة صریحا، والاستئذان طلب ان تاذن ولاتمنع وادناه السکوت (۲۲)

''میں کہتا ہوں یہ بھی جائز نہیں کہ صرف اولیاء کو ہی حاکم بنا کر عورتوں کے نکاح کا پورا اختیار دیدیا جائے ،اس لیے کہ وہ نہیں جانتے اس بات کو جسے عورت اپنی ذات کے بارے میں جانتی ہے۔اور اس لیے کے عقد کا نقصان اور نفع عورت کی طرف لوٹنے والا ہے۔اور استمارا اس بات کی طلب ہے کہ وہ ہی صراحتا حکم دینے والی ہو۔اور استیذ ان اس بات کی طلب ہے کہ وہ اجازت دے اور وہ انکار نہ کرے اور اجازت کا ادنی درجہ خاموشی ہے۔''

شاہ صاحب کے اس محققانہ کلام سے احناف اور جمہور دونوں کی رائے قابل عمل ہوگئیں کہ نہ تو بالکلیہ صرف عورت کے ہاتھ میں شادی و بیاہ کا اختیار ہو اور نہ ہی اولیاء کو مکمل طور پر اختیار ہو بلکہ آپس کی مشاورت سے،عورت کی اجازت ورضامندی سے شادی و بیاہ کا یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے تا کہ بعد میں کسی قسم کی تلخیاں اور لڑائی جھگڑے سکون زندگی برباد نہ کرسکیں۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہوا کہ''اقول'' سے شاہ صاحب عمدہ فوائد ونکات بیان کرتے ہیں۔

۳۔بسا اوقات ''وَالْاَصْل'' کہہ کر اپنے دعوی کا اثبات کرتے ہیں۔اور اسے ۵۰ سے زائد مقامات پر لائے ہیں۔جو بنیادی دلیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔کہیں تو''والاصل'' کہہ کر آیت کریمہ لاتے ہیں اور کبھی حدیث رسول ﷺ نقل کرتے ہیں اور کہیں عقلی دلیل پیش کرتے ہیں۔

آیت کی مثال:

شاہ صاحب نے باب قائم کیا :

باب اسباب نزول الشرائع الخاصة بعصر دون عصر وقوم دون قوم (۲۳)

''وہ اسباب جن کی وجہ سے مخصوص زمانوں میں مختلف قوموں کے لیے خاص شریعتیں نازل ہوئیں۔''

اس کے بعد شریعتوں کے مختلف ہونے کے وجوہ اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والاصل فيه قوله تعالى ﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَاْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴾ (۲۴)

اور بنیاد اس میں اللہ تعالی کا قول، بنی اسرائیل کے لیے سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں مگر وہ چیز جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کی تھی کہہ دو تورات لاو اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔''

اس کے بعد شاہ صاحب نے باب سے متعلقہ بحث کی ہے اور اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

اور اسی طرح شاہ صاحب نے باب قائم کیا:

باب اسباب النسخ (۲۵)

''نسخ کے اسباب کا بیان۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں:

والاصل فیه قوله تعالی ﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا﴾ (۲۶)

''اور بنیادی دلیل اس میں اللہ تعالی کا قول ہم جو کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر لاتے ہیں۔''

حدیث کی مثال:

لوگوں کی جبلت اور فطرت کے بارے میں کلام کرتے ہوئے شاہ صاحب نے ایک باب قائم کیا:

باب اختلاف الناس فی جبلتهم المستوجب لاختلاف اخلاقهم واعمالهم ومراتب کمالهم (۲۷)

''جبلت میں لوگوں کے مختلف ہونے کا بیان جو ان کے اخلاق واعمال اور کمال کے مرتبوں کے مختلف ہونے کا سبب ہے۔''

مذکورہ باب کے قائم کرنے سے شاہ صاحبؒ کا مقصد لوگوں کے اخلاق واعمال اور کمال میں مختلف ہونے کی وجہ بیان کرنا ہے۔ کہ اس کا سبب لوگوں کی جبلت اور فطرت کا مختلف ہونا ہے جس کی وجہ سے ان کے کمالات واخلاقیات اور عملیات میں یکسانیت نہیں ہے۔

اس بات کو مزید مدلل کرنے کے لیے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

والاصل فیه ماروی عن النبی ﷺ انه قال اذا سمعتم بجبل زال عن مکانه فصدقوه ،و اذا سمعتم برجل تغیر عن خلقه فلا تصدقوا به فانه یصیر الی ما جبل علیه (۲۸)

''اور بنیادی دلیل اس میں وہ روایت ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لو اور جب تم کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کو مت مانو پس بے شک وہ لوٹنے والا ہے اس فطرت کی طرف جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔''

اسی طرح متعدد مقامات پر شاہ صاحب احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر احادیث کے نقل کرنے کے بعد ان کی صحت وسقم پر بالکل کلام نہیں کرتے، بلکہ بسا اوقات احادیث ضعیفہ سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً شاہ صاحب نے ایک حدیث نقل کی:

لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ (۲۹)

''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔''

جبکہ محققین نے اس حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ امام علاء الدین کاسانی (م-۵۸۷ھ) لکھتے ہیں:

لا نکاح إلا بولی مع ما حکی عن بعض النقلة ان ثلاثة احادیث لم تصح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وعد من جملتها هذا ولهذا لم یخرج فی الصحیحین (۳۰)

''لا نکاح إلا بولی کے بارے میں بعض اہل علم نے نقل کیا ہے کہ تین احادیث نبی کریم ﷺ سے صحیح روایت نہیں کی گئیں اور ان میں ایک یہی حدیث ہے اسی لیے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں ہے۔''

شیخ جمال الدین رومی البابرتی (م-۷۸۶ھ) لکھتے ہیں:

روی عن یحیی بن معین رحمه الله انه قال :الاحادیث الثلاثة لیست بثابتة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم احدها قوله علیه الصلاة والسلام : لا نکاح إلا بولی وشاهدی عدل (۳۱)

''یحییٰ بن معین سے روایت کی گیا کہ تین احادیث حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہیں ان میں سے ایک لا نکاح إلا بولی وشاهدی عدل ہے۔''

امام بدرالدین عینی (م-۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

وقال یحیی بن معین واسحاق بن راهویه تنسب إلیه ثلاثة احادیث لم تثبت عن رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احدها لا نکاح إلا بولی (۳۲)

''یحییٰ بن معین اور اسحاق بن راھویہ نے کہا تین احادیث کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی جاتی ہے مگر وہ آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہیں ان میں سے ایک ہے۔لا نکاح إلا بولی ''

علامہ ابن نجیم (م-۹۷۰ھ) نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔(۳۳) اور یہی رائے علامہ شامی (م ۱۲۵۲ھ) کی ہے (۳۴)

اسی طرح شرک کی صورتیں بیان کرتے ہوئے ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

فی الحدیث اَن حَوَّاء سمت وَلَدهَا عبد الْحَرُث وَكَانَ ذَلِک من وَحی الشَّیْطَان وقد ثبت فی احادیث لاتحصی ان النبی ﷺ غیر اسماء اصحابه عبدالعزیز وعبدشمس ونحو هما الی عبدالله وعبدالرحمن وما اشبههما فهذه اشباح وقوالب للشرک نهی الشارع عنها لکونها قوالب له والله اعلم (۳۵)

''اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حواء نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا اور یہ نام رکھنا شیطان کے اشارے سے تھا اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ناموں کو بدل دیا اور عبدالعزی، اور عبدالشمس اور ان کے مانند ناموں کی جگہ عبداللہ، عبدالرحمٰن اور ان سے ملتے جلتے نام

رکھے۔غرض یہ شرک کی صورتیں اور سانچے ہیں شریعت نے ان سے اس لیے منع کیا کہ شرک ان سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے۔باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔''

شاہ صاحب نے حضرت حواء کے واقعہ والی جو حدیث نقل کی ہے اس کو محققین نے ضعیف اور اسرائیلات میں شمار کیا ہے۔

امام بن کثیر (م-۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

والغرض ان هذا الحديث معلول من ثلاثة اوجه احدها ان عمر بن إبراهيم هذا هو البصري وقد وثقه ابن معين، ولكن قال ابو حاتم الرازى لا يحتج به، ۔۔۔ الثانى انه قد روى من قول سمرة نفسه ليس مرفوعا، كما قال ابن جرير :حدثنا ابن عبد الاعلى، حدثنا المعتمر عن ابيه، حدثنا بكر بن عبد الله بن سليمان التيمى عن ابى العلاء بن الشخير عن سمرة بن جندب قال :سمى آدم ابنه عبد الحارث .الثالث ان الحسن نفسه فسر الآية بغير هذا، فلو كان هذا عنده عن سمرة مرفوعا لما عدل عنه قال ابن جرير حدثنا ابن وكيع حدثنا سهل بن يوسف عن عمرو عن الحسن جعلا له شركاء فيما آتاهما قال كان هذا فى بعض اهل الملل ولم يكن بآدم(۳۶)

''اور خلاصہ یہ کہ یہ حدیث کئی وجہوں سے معلول (کمزور) ہے۔پہلی وجہ اس حدیث کے راوی عمر بن ابراہیم کو اگرچہ ابن معین نے ثقہ کہا ہے مگر ابوحاتم رازی نے کہا اس کی روایت قابل حجت نہیں، دوسری وجہ یہی روایت حضرت سمرۃ سے موقوفا روایت کی گئی ہے۔جیسا کہ ابن جریر نے کہا کہ سمرہ بن جندب کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا۔اور تیسری وجہ اس حدیث کے راوی حضرت حسن بصری نے اس کے علاوہ تفسیر کی ہے۔اگر یہ حضرت سمرہ نے مرفوعا بیان کی ہوتی تو یہ اس سے اعراض نہ کرتے۔ابن جریر نے کہا کہ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ یہ حضرت آدم کا واقعہ نہیں بلکہ دیگر مذاہب والوں کا واقعہ ہے۔''

امام ابن کثیرؒ کے کلام کا حاصل نکات کی صورت میں درج ذیل ہے۔

۱۔ اس حدیث کے راوی عمر بن ابراہیم کی روایت کو امام ابوحاتم رازیؒ نے ناقابل حجت قرار دیا ہے۔

۲۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے یہ روایت موقوفا نقل کی گئی ہے۔

۳۔ اس حدیث کے راوی حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں یہ حضرت آدمؑ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ دیگر مذاہب والوں کا واقعہ ہے۔

ان وجوہ کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔ (جاری)

حوالہ جات

(۱) شاہ ولی اللہ، احمد بن عبدالرحیم، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، س ن، جلد ا، صفحہ ۱۰

(۲) القرآن، آل عمران: ۷

(۳) القرآن، النساء: ۲۳

(۴) القرآن، المائدہ: ۹۳

(۵) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد ا، صفحہ ۱۷۲

(۶) القرآن، النساء: ۹۲

(۷) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۲، صفحہ ۱۵۳

(۸) ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث، السجستانی، السنن، بیروت، المکتبۃ العصریہ، س ن، جلد ۳، صفحہ ۳۲۳

(۹) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد ا، صفحہ ۱۷۱

(۱۰) ایضا، جلد ا، صفحہ ۱۷۱
ابوداؤد، السنن، جلد ۳، صفحہ ۳۲۱

(۱۱) ایضا، جلد ا، صفحہ ۱۷۱

(۱۲) القرآن، الاحزاب: ۵۹

(۱۳) القرآن، الاحزاب: ۵۳

(۱۴) القرآن، النور: ۳۰

(۱۵) حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۶

(۱۶) الترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی، السنن، مصر، مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۹۵ھ، جلد ۳، صفحہ ۴۵۹

(۱۷) الزیلعی، فخر الدین، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، قاہرہ، المطبعۃ الکبری الامیریۃ، ۱۳۱۳، جلد ۲، صفحہ ۱۱۷

(۱۸) ابن رشد، محمد بن احمد، ابوالولید، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، قاہرہ، دار الحدیث، ۱۴۲۵ھ، جلد ۳، صفحہ ۳۶

(۱۹) ابن قدامہ المقدسی، عبداللہ بن احمد، المغنی، مکتبۃ القاہرہ، ۱۳۸۸ھ، جلد ۷، صفحہ ۷

(۲۰) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، جلد ۲، صفحہ ۱۲۷

(۲۱) حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۷

(۲۲) ایضا، جلد ۲، صفحہ ۱۲۷

(۲۳) ایضا، جلد ا، صفحہ ۸۸

(۲۴) القرآن، آل عمران:۹۳

حجۃ اللہ البالغہ، جلد۱، صفحہ۸۸

(۲۵) حجۃ اللہ البالغہ، جلد۱، صفحہ۸۸

(۲۶) ایضا، جلد۱، صفحہ۸۸

القرآن، البقرہ:۱۰۶

(۲۷) حجۃ اللہ البالغہ، جلد۱، صفحہ۲۶

(۲۸) ایضا، جلد۱، صفحہ۲۶

احمد بن حنبل، الامام، المسند، موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۰ھ، جلد۴۵، صفحہ۴۹۱

(۲۹) حجۃ اللہ البالغہ، جلد۲، صفحہ۱۲۷

ابوداود، جلد۲، صفحہ۲۲۹

(۳۰) الکاسانی، علاء الدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۶ھ، جلد۲، صفحہ ۲۴۹

(۳۱) البابرتی، جمال الدین، محمد بن محمد، العنایہ شرح الہدایۃ، دارالفکر، س ن، جلد۱۰، صفحہ۹۳

(۳۲) العینی، بدرالدین، محمود بن احمد، البنایہ شرح الہدایہ، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۰ھ، جلد۵، صفحہ۷۶

(۳۳) ابن نجیم، زین الدین ابراہیم، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، دارالکتاب الاسلامی، س ن، جلد۳، صفحہ۱۱۷

(۳۴) شامی، ابن عابدین، محمد امین، ردالمحتار علی الدر المختار، بیروت، دارالفکر، ۱۴۱۲ھ، جلد۳، صفحہ۵۶

(۳۵) حجۃ اللہ البالغہ، جلد۱، صفحہ۶۳

الترمذی، السنن، جلد۵، صفحہ۲۶۷

(۳۶) ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، ابوالفداء، تفسیر القرآن العظیم، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ، جلد۳، صفحہ ۴۷۵

مباحثہ ومکالمہ

مولانا عبدالغنی مجددی*

''مقالات ایوبی'' پر ایک نظر

مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی آزاد کشمیر کے بزرگ علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے جامعہ اشرفیہ میں متعدد عظیم شخصیات سے علم حاصل کیا جن میں مولانا رسول خان اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی جیسی عظیم المرتبت شخصیات شامل ہیں۔ ایک عرصہ تک اسلام آباد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد کئی سال ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں تعلیم حاصل کی اور حرم مکہ کی برکات وفیوض سے فیضیاب ہوتے رہے۔ مکہ مکرمہ سے واپسی پر آزاد کشمیر حکومت کی طرف سے میر پور کے ضلع مفتی مقرر کیے گئے اور ریٹائرمنٹ تک حکومت اور عوام کی شرعی راہ نمائی کرتے رہے۔ اس وقت موصوف کشمیر میں شرعی افتاء اور دینی راہ نمائی کے میدان میں وقیع علمی وفقہی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مقالات ایوبی کا مختصر تعارف:

''مقالات ایوبی'' مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے دعا کے آداب سے لے کر فقہ وقضاء کے نازک مسائل، اسلام اور دہشت گردی اور اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق جیسے حساس عنوانات کے امور پر بحث کی ہے۔

مرتب نے کتاب کے مقالات کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق اصلاح وتربیت سے ہے، دوسرا حصہ فقہ وقضاء سے متعلق ہے اور تیسرے حصے میں متفرقات شامل ہیں۔

مولانا کے اسلوب تحریر کی چند نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

- مولانا کسی نکتے کو اصل ماخذ سے ثابت کرنے کو اولیں حیثیت دیتے ہیں، تاہم مسائل کے اثبات میں فقہی جزئیات کو بھی پیش کرتے ہیں۔
- مولانا بعض مسائل میں اپنی اجتہادی رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں جس کا کلی طور پر فقہی روایت کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔
- مولانا مسئلہ کے ضمن میں اس سے متعلقہ واقعات کو بھی ذکر کرتے ہیں جس سے مقصود اصلاح احوال ہوتا ہے۔

*استاذ الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ۔ ایم فل اسکالر شعبہ علوم اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ

- مولانا بات کی توضیح اچھی طرح کرتے ہیں۔ مسئلہ سے ملتی جلتی صورتیں بھی ذکر کرتے ہیں جس سے مسئلہ کی تنقیح اچھی طرح ہو جاتی ہے۔

تاہم اس کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مولانا نے بے جا سختی سے کام لیا ہے جو اسلام کے عمومی اصول تیسیر اور دفع حرج کے خلاف ہے۔ مولانا نے کئی مقامات پر ان باتوں کو جو مکروہات کے ضمن میں آتی ہیں، حرام کا درجہ دے دیا ہے اور اس حوالے سے کوئی ایسے ٹھوس دلائل وشواہد بھی پیش نہیں کیے جن کی بنا پر ان چیزوں کو فقہاء کے عمومی موقف سے ہٹ کر، حرام کہا جا سکتا ہو۔

۱۔ مثال کے طور پر مولانا لکھتے ہیں کہ ''اسلام نے جعلی بولی لگانے سے منع کیا ہے اور اس طرح جو سودا ہوگا، اس کی اصل قیمت اور نفع سب حرام ہوگا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو نجش کہتے ہیں۔'' (ص ۵۲) حالانکہ فقہی طور پر یہ صورت حرمت میں نہیں، بلکہ کراہت کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے متعدد چیزوں کو ایک ساتھ ذکر کیا جن میں جعلی بولی، تلقی رکبان اور شہری کی بیع دیہاتی کے لیے شامل ہیں۔ پھر ان پر حکم لگایا کہ یہ سب مکروہ ہیں اور ان کی وجہ سے بیع فاسد نہ ہوگی، کیونکہ فساد صلب عقد میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی صحت کی شرائط میں ہے، بلکہ خارج اور زائد معنی میں فساد ہے۔ (جلد ۵ ص ۱۴۲)

۲۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''مبالغہ آمیز اشتہار بازی، ایسے فوائد کا اشتہار جو حقیقتاً موجود نہ ہوں، اس طرح کی اشیاء فروخت کر کے نفع کمانا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔'' (ص ۴۸)

اگر اوپر بیان کردہ قاعدہ کو ملحوظ رکھا جائے تو ان چیزوں میں بھی صلب عقد میں فساد موجود نہیں بلکہ خارجی اور زائد معنی میں فساد ہے جس کی وجہ سے ان چیزوں کی تجارت کو حرام قرار دینا محل نظر ہے۔ مزید برآں فقہ کی کتابوں میں ایک جزئیہ ملتا ہے کہ: بائع نے غلام بیچا اس شرط پر کہ وہ خباز ہے یا کاتب ہے اور نکلا اس کے خلاف تو مشتری کو اختیار ہے، اگر چاہے تو لے لے اس کو پورے ثمن کے ساتھ یا چھوڑ دے۔ صاحب ہدایہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا وصف ہے جس کی وجہ سے مبیع کو خریدنے میں رغبت پیدا ہوتی ہے تو عقد میں شرط لگانے سے مشتری اس کا حق دار ہو گا۔ پھر اس کا ایسا نہ ہونا خیار کو واجب کر دیتا ہے کیونکہ مشتری اس کے بغیر راضی نہیں ہوا اور یہ لوٹتا ہے نوع کے اختلاف کی طرف۔ اغراض میں تفاوت کے کم ہونے کی وجہ سے تو نہیں فسد ہوگا عقد اس کے معدوم ہونے کی صورت میں۔ (ص ۵۰ باب خیار الشرط)

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ وصف کے معدوم ہونے کی صورت میں عقد فاسد نہ ہوگا۔

۳۔ ایک اور عبارت ملاحظہ ہو:

''بعض تاجر گاہک کو بازار کے بھاؤ نہیں بتاتے اور اپنا سودا قسمیں اٹھا کر مہنگے داموں فروخت کر کے دیہاتی اور غیر ملکی گاہکوں کو لوٹتے ہیں۔ اسلام نے اس طرح کی کمائی کو حرام قرار دیا ہے۔'' (ص ۵۰)

بخاری ومسلم کی روایت میں تلقی رکبان سے منع کیا گیا ہے۔ اس کو مولانا نے دلیل حرمت کے طور پر پیش کیا ہے،

لیکن فقہی ذخیرے میں اگر دیکھا جائے تو تلقی رکبان کو کراہت کے درجے میں رکھا گیا ہے نہ کہ حرام کے درجہ میں۔اس کو حرام کہنا بایں وجہ بھی درست نہیں کہ اس میں بھی صلب عقد میں فساد نہیں ہے۔صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ اور اس طرح کے کچھ دیگر مسائل کو باب فی ما یکرہ کے تحت نقل کیا ہے۔

۴۔اسی طرح مولانا فرماتے ہیں کہ ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے،اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں ہے؛عبارت ملاحظہ ہو:

''حدیث شریف کے الفاظ ہیں کہ ذخیرہ اندوز گناہ گار ہے اور اس میں کسی شے کی تخصیص نہیں ہے،لہٰذا جو اشیاء بھی عوام الناس کے لیے ضروری ہیں،ان کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔''

مولانا نے یہاں بھی مبالغہ کیا ہے اور مکروہ کو حرام قرار دیا ہے۔امام قدوری لکھتے ہیں:

''اور مکروہ ہے ذخیرہ اندوزی کرنا آدمیوں اور چوپایوں کی خوراک میں۔''

اور ہدایہ میں ہے کہ اصل اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔نیز اس وجہ سے بھی کہ عوام کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو گیا ہے اور بیع سے رکنے میں ان کے حق کو باطل کرنا ہے اور ان پر معاملے کو تنگ کرنا ہے،پس یہ مکروہ ہوگا جبکہ ان کو نقصان دیتا ہو۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے،حرام نہیں ہے۔

قاضی صاحب نے دوسرا مبالغہ یہ کیا کہ ہر قسم کی ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیا کہ اس میں کسی شے کی تخصیص نہیں کی ہے،جبکہ فقہاء نے بعض صورتوں کی تخصیص کی ہے۔امام قدوری لکھتے ہیں:

''اور جس نے ذخیرہ اندوزی کی اپنی زمین کے غلہ کی یا جس کو لایا ہو دوسرے شہر سے تو اس کو ذخیرہ اندوزی کرنے والا شمار نہیں کریں گے۔''(ص ۲۶۰ کتاب الحظر والاباحۃ)

اس عبارت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں ذخیرہ اندوزی کرنے میں کوئی قباحت نہیں،اس لیے کہ یہ صورتیں درحقیقت ذخیرہ اندوزی میں داخل ہی نہیں ہیں۔

۵۔قاضی صاحب کی ایک عبارت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرا نکاح جائز ہی نہیں۔فرماتے ہیں:

بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ ھشام بن مغیرہ نے حضور اکرم ﷺ سے حضرت علیؓ کے بارے عرض کیا کہ ہم اپنی بیٹی حضرت علی کی زوجیت میں دینا چاہتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا میں ہرگز اجازت نہ دوں گا،ہرگز اجازت نہ دوں گا،فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔

مولانا اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''اگر حضرت علیؓ جیسی عظیم المرتبت ہستی کے بارے یہ خدشہ ہو سکتا ہے کہ وہ فاطمہؓ سے انصاف نہ کر سکیں گے اور حضور ان کو دوسری شادی سے روک دیں تو آج کون مائی کا لعل ہے جو عدل کے تقاضے پورے کر سکے؟''

مولانا کی یہ عبارت بظاہر یہ کہہ رہی ہے کہ مولانا کے ہاں ایک سے زائد شادی کی اجازت نہیں ہے،کیونکہ آج

عدل کے تقاضے پورے ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ بجائے اس کے کہ مولانا اس جزوی واقعہ کی کوئی ایسی تعبیر پیش کرتے جس سے اصول وضابطہ اسی طرح رہتا، مولانا نے اس جزوی واقعہ کی بنا پر اصولی حکم کو ہی بدل دیا۔ اگر حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس لیے منع کیا تھا کہ ان سے عدل کے تقاضے نہیں پورے ہو سکتے تو کیا حضرت علی نے سیدہ کے انتقال کے بعد متعدد نکاح نہیں کیے؟ اگر مولانا کی بات درست ہے تو حضرت علی نے متعدد نکاح کیوں کیے؟ یہ بات تسلیم کر لینے کی صورت میں تو حضرت علیؓ کے مابعد کی امت میں سے کسی فرد کو بھی دوسری شادی کی اجازت نہ ہونی چاہیے، جبکہ دور صحابہ سے آج تک لوگ متعدد شادیاں کرتے چلے آ رہے ہیں اور فقہاء امت میں سے بھی کسی نے اس کے متعلق حرمت یا کراہت کا قول اختیار نہیں کیا۔

۶۔ اگر کوئی مرد خود کو کنوارا ظاہر کرے جبکہ شادی شدہ ہو اور کسی عورت سے اس طرح نکاح کر لے تو کیا بیوی کو فسخ نکاح کا حق ہوگا؟ قاضی صاحب اس کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں؛

> ''اگر محمد جہانگیر سراج بی بی کو شادی سے قبل بتا دیتا کہ وہ انجم پروین مرزا کا شوہر ہے تو کیا سراج بی بی قبول کر لیتی؟ ہرگز نہیں، خاص طور پر انگلستان جیسے معاشرہ میں جہاں قانوناً دوسری شادی ممنوع ہے..... یوں اس نے دھوکہ دہی اور تدلیس کا ارتکاب کیا۔ شریعت نے اگر فسخ نکاح کا حق خاوند کے بغلوں کی بدبو، خراٹوں اور جنسی تسکین کی عدم تکمیل پر دیا ہے تو پہلی بیوی کی موجودگی کو اخفاء میں رکھ کے شادی کرنے پر فسخ کا حق کیوں نہیں، جبکہ سوکن پر یہ تمام عیوب سے زیادہ مضر ہے۔'' (ص ۷۵)

مولانا کی عبارت اپنے مطلب ومفہوم میں بالکل عیاں ہے۔ اس پر اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے شوہر کے، نکاح کو مخفی رکھنے کو عیب شمار کیا ہے۔ اولاً تو اس کا عیب ہونا محل نظر ہے۔ فقہاء نے عیوب کی فہرست میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اگر عیب ہو بھی تو کیا یہ ایسا عیب ہے جس کی وجہ سے عورت کے لیے خیار ثابت ہو؟

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر کو جنون، جذام یا برص ہو تو عورت کو کوئی اختیار نہیں ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے نزدیک۔ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ عورت کے لیے خیار ہے تاکہ وہ خود سے خاوند کو دور کر سکے جیسا کہ مجنون اور عنین میں اختیار ہے۔ بخلاف مرد کی جانب کے، کیونکہ وہ خود سے ضرر کو طلاق کے ذریعے دفع کر سکتا ہے۔ شیخین فرماتے ہیں کہ اصل، خیار کا نہ ہونا ہے کیونکہ اس میں شوہر کے حق کو باطل کرنا ہے اور ثابت ہوگا مجبوب اور عنین میں کیونکہ یہ مقصود نکاح کو پورا کرنے میں خلل انداز ہیں، جبکہ مذکورہ عیوب اس میں خلل واقع نہیں کرتے۔ اس لیے دونوں جدا ہیں۔'' (باب العنین جلد ۳ ص ۲۸۰)

جب بڑے اور مرکزی عیوب کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے اور دو بڑے امام یہ کہتے ہیں کہ ان کی بنا پر عورت کو خیار نہیں ملے گا تو تدلیس کے بارے میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بنا پر عورت کو فسخ نکاح کا اختیار ملے گا؟ باقی مولانا کی یہ بات کہ عورت سوکن کو برداشت نہیں کر پاتی اور یہ اس کے لیے باعث تکلیف ومضرت ہے تو اس پر سوال یہ ہے کہ بعینہ یہی مضرت وتکلیف اس وقت بھی پائی جاتی ہے جب خاوند پہلی بیوی کو بتا کر دوسری شادی کرے۔ تو کیا

اس صورت میں بھی پہلی بیوی کو خیار فسخ دیا جائے گا؟ اگر نہیں تو یہاں کیوں؟

۷۔ مولانا نے بعض امور میں ایک ہی جگہ ایک ہی بات کو اور انداز میں جبکہ دوسری جگہ اسی بات کو دوسرے انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہے۔ نتیجتاً قاری ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاکستان کے عدالتی وقانونی نظام کے متعلق کتاب کے ایک ہی صفحہ پر دو مختلف باتیں یوں لکھتے ہیں:

''جہاں تک عدالتی سسٹم کا تعلق ہے تو وہ ہرگز اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ عدالتی نظام انہی بنیادوں پر استوار ہے جو بنیادیں مسلم فقہاء نے متعین کر رکھی ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''نہ کفر پر مبنی ہے نہ مکمل اسلام کے مطابق ہے۔ درمیانہ سا ہے، قابل برداشت ہے۔'' (ص ۷۹)

اسی طرح غیر مسلم عدالتوں کی طرف سے فسخ نکاح کی شرعی حیثیت سے متعلق ایک جگہ مولانا نے یہ لکھا ہے کہ:

''موضوع زیر بحث میں اگرچہ برطانوی قانون کے مطابق انگلستان میں عدالتیں قائم ہیں اور وہی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے فیصلے بلاتفریق مذہب کرتی ہیں، مگر چونکہ ایسے معاملات میں فقہاء اسلام نے دوسری راہیں متعین کی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس لیے نکاح وطلاق کے معاملات میں ان عدالتوں کی شرعی حیثیت کو نظریہ ضرورت کے تحت تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' (ص ۶۹، ۷۰)

جبکہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''پاکستان اسلامی ملک ہے اسکی عدالتوں کے فیصلے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم نے تو ۱۹۹۰ میں انگلستان کی عدالتوں کے فیصلوں کو بھی تسلیم کرنے کا فتویٰ دیا ہے کہ وہاں کا ماحول یہاں سے زیادہ خوفناک ہے۔ اگر وہاں خاوند تعنت کا مظاہرہ کرتا ہے اور طلاق نہیں دیتا تو وہاں بدکاری کے لیے راستے کھلے ہیں، اس لیے دونوں میاں بیوی عدالت میں حاضر ہو کر اپنا موقف بیان کرتے ہیں تو فیصلے بھی قابل عمل ہیں۔'' (ص ۸۲)

ان دو عبارتوں میں تضاد بالکل واضح ہے۔ پہلی میں مولانا نے غیر مسلم عدالتوں سے نکاح وطلاق کے مسائل حل کروانے کی نفی کی ہے جبکہ دوسری میں اس کی اجازت بیان کی ہے۔

یہاں اس بحث سے متعلق ایک ضمنی نکتہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا غیر مسلم عدالتیں مسلمانوں کے نکاح فسخ کر سکتی ہیں یا نہیں؟ اس ضمن میں مولانا نے متعدد آیات قرآنیہ سے یہ بات ثابت کی کہ قانون اللہ رب العزت کا ہی ہونا چاہیے اور اسلام کفر کی بنیاد پر قائم کردہ عدالتوں کی قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے بعد مولانا نے فقہاء کی بیان کردہ قاضی کی شرائط لکھیں جس میں ایک شرط مسلمان ہونا بھی ہے۔ مولانا کا ان شرائط کو بیان کرنے سے مقصود سابقہ مسئلہ کو موکد کرنا ہے۔ میرے خیال میں یہاں مولانا نے دو مسئلوں کو خلط کر دیا ہے۔ ایک مسئلہ ہے کفار کی عدالتوں اور کتاب اللہ سے متصادم قانونی نظام کا اور دوسرا مسئلہ ہے ایک مسلمان اور اسلامی ملک میں غیر مسلم قاضی کا۔ پہلے مسئلہ میں تو قدیم وجدید فقہا یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اللہ کے قائم کردہ اصول وضوابط سے ہٹ

کر فیصلہ کروانا کسی مسلمان کے لیے درست نہیں۔ دوسرا مسئلہ بھی اگرچہ قدیم فقہاء کے مابین متفق علیہ ہے، لیکن دور جدید بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت بہت سے اہل علم نے قدیم موقف سے ہٹ کر نیا موقف اختیار کیا ہے اور آج اکثر مسلم ممالک میں اس نئے موقف پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً مجلۃ الاحکام العدلیہ میں بھی قاضی کے مطلوبہ اوصاف میں مسلمان ہونے کی شرط شامل نہیں کی گئی۔ پاکستان میں ایک سے زیادہ غیر مسلم جج (جسٹس کارنیلیس، جسٹس بھگوان داس) اعلیٰ عدالتوں میں قضا کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید جمہوری ممالک میں عموماً قانون، مقنّنہ کی طرف طے شدہ ہوتا ہے۔ قاضی مسلمان ہو یا کافر، وہ اس طے شدہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف قانون کو عدالت میں پیش کردہ مقدمے پر منطبق کرنا ہوتا ہے۔ (دیکھیے ''حدود وتعزیرات'' از محمد عمار خان ناصر، ص ۳۱۶، ۳۱۸)

بہر حال ان چند طالب علمانہ ملاحظات سے ہٹ کر ''مقالات ایوبی'' کے عنوان سے یہ مجموعہ اہم دینی وفقہی مسائل پر قاضی محمد رویس خان ایوبی صاحب کے غور وفکر اور وقیع نتائج تحقیق کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہم نے بعض امور سے متعلق قاضی صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف کی جسارت کی ہے۔ امید ہے کہ وہ اسے ایک طالب علم کا علمی حق سمجھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے نوازیں گے۔

امیر عبد القادر الجزائریؒ

تصنیف: جان ڈبلیو کائزر ○ بیس لفظ: مولانا زاہد الراشدی

الجزائر کے عظیم مجاهد آزادی کی داستان حیات

''عظیم آدمی اتنی فراوانی سے نہیں ملتے کہ ہم ان کے لیے دو بول کہے بغیر انہیں گنوا دیں۔..... ایک پکا محبّ وطن، ایک ایسا سپاہی جس کی فطانت اور حاضر دماغی شک وشبہے سے بالاتر ہو، جس کا وقار بے داغ ہو، ایک ایسا ریاست کار جو افریقہ کے جنگلی قبائل کو متحد کر کے بے مثال مدمقابل بنا سکے، ایک ایسا ہیرو جو حرف شکایت زبان پر لائے بغیر شکست اور تباہی کو تسلیم کر لے، اگر یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک آدمی کو عظیم بناتی ہیں تو پھر عبد القادر اس صدی کے چند گنے چنے عظیم آدمیوں کی سب سے اگلی صف میں کھڑا ہونے کا حق دار ہے۔'' (نیویارک ٹائمز، فروری ۱۸۸۳ء)

[صفحات: ۴۵۶ ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے]

ناشر: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور

مباحثہ ومکالمہ

مکاتیب

(۱)

ماہنامہ الشریعہ ستمبر 2015ء کے شمارے میں مولانا حافظ محمد رشید کا لکھا ہوا ایک مضمون ''سید احمد شہیدؒ کی خدمات پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا احوال'' پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ مضمون ہزارہ یونیورسٹی میں قائم ''ہزارہ چیئر'' کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور خدمات کے حوالے سے ایک بین الاقوامی سیمینار کی رپورٹ ہے۔ مضمون پڑھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا کہ ہمارے اصلی قومی وملی محسنین کو یاد رکھنے والے الحمد اللہ آج بھی زندہ ہیں۔ آج جب ہمارا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اسلاف کے کارناموں سے قوم کو آگاہ کرنے کے حوالے سے مسلسل چشم پوشی کے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، ایسے دور میں اس نوعیت کے سیمینار منعقد کرنا نہ صرف یہ کہ پوری قوم پر احسان ہے بلکہ آخرت میں سرخروئی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ سیمینار کے منتظمین کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آمین

راقم امیر المومنین مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ کی شخصیت اور ان کی بپا کردہ تحریک سے خصوصی دلچسپی رکھتا ہے۔ امسال 6 مئی 2015ء کو تحریک شہدائے بالاکوٹ کے 127 سال مکمل ہونے پر راقم نے اپنی قائم کردہ الشاہ عبد العزیز محدث دہلوی اکادمی کے زیر اہتمام اٹک میں ''برصغیر میں احیاء اسلام کی جدوجہد سید احمد شہیدؒ کے افکار کی روشنی میں'' کے عنوان پر ایک فکری ونظریاتی مجلس مذاکرہ کا انعقاد کروایا تھا۔ اور جس سکول میں راقم تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہے، وہاں اسی روز سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حوالے سے ایک کوئز مقابلہ (Quiz Competition) طلبہ کے مابین منعقد کروایا۔ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک مختصر سی کاوش تھی۔ بہر صورت، اللہ تعالیٰ ہم سب کی ان کاوشوں کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول ومنظور فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

فی الوقت میں اپنے معزز قارئین کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ اس مسئلے پر بحث شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اکادمی کے زیر اہتمام ہونے والے مجلس مذاکرہ میں بھی کی گئی تھی۔ یعنی کیا تحریک سید احمد شہیدؒ اور تحریک طالبان پاکستان میں کسی قسم کی فکری مماثلت پائی جاتی ہے؟ یہی بحث ہزارہ یونیورسٹی میں منعقدہ سیمینار میں بھی ہوئی۔ بقول مولانا حافظ محمد رشید، ''سید صاحبؒ کی تحریک کے عصر حاضر کے ساتھ تعلق پر جو سوال بار بار زیر بحث آیا، وہ ان کی تحریک اور طالبان تحریک خصوصاً پاکستانی طالبان کے نظریات کے درمیان مماثلت کا سوال تھا۔ یعنی سید

صاحبؒ اگر ہتھیار اٹھا کر ایک خطہ لینا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں مسلح کوشش کرتے ہیں تو وہ جہاد کہلاتا ہے اور طالبان اگر یہی کام کرتے ہیں تو وہ دہشت گردی کہلاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ گویا طالبان تحریک سید صاحبؒ کی جدوجہد ہی کا ایک تسلسل ہے۔ (''الشریعہ: ستمبر 2015ء ص 55)

درج بالا شذرہ میں پاکستانی تحریک طالبان کو تحریک سید احمد شہیدؒ کا تسلسل قرار دیا گیا ہے اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ سید صاحبؒ بھی مسلح جدوجہد کے ذریعے ایک خطہ زمین حاصل کرنا چاہتے تھے اور طالبان بھی یہی چاہتے ہیں۔ ہمیں اس دعویٰ سے مکمل اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک سید احمد شہیدؒ اہل سنت ہیں اور پاکستانی طالبان خوارج ہیں۔ پاکستانی طالبان اور تحریک سید احمد شہیدؒ میں فکری مماثلت کی یہ ہرگز دلیل نہیں بنتی کہ دونوں ایک خطہ زمین مسلح جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں تحریکات میں فکری مماثلت کے وجود وعدم وجود کے لیے ان کے افکار و نظریات سے آگاہی ضروری ہے۔ دنیا میں ہمیں اور بھی بہت سی ایسی تحریکات مل جائیں گی جو مسلح جدوجہد کے ذریعے ایک خطہ زمین حاصل کرنا چاہتی تھیں یا ہیں، لیکن کوئی ذی شعور انسان ان تحریکات اور سید صاحبؒ کی تحریک کو ایک تسلسل نہیں قرار دے گا کیوں کہ سید صاحبؒ کی تحریک اور ان تحریکات کے افکار ونظریات میں بہت زیادہ بعد ہے۔ تحریکات کا تسلسل افکار ونظریات کی ہم آہنگی سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص طرز عمل کی یکسانیت کی بنیاد پر۔

سید احمد شہیدؒ کے تحریکی نظریات اور پاکستانی طالبان کے نظریات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں درج ذیل تین سوالات کے جوابات چاہییں:

i۔ کیا سید احمد شہیدؒ فاسق وفاجر کلمہ گو مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے؟

ii۔ کیا سید احمد شہیدؒ عامۃ المسلمین کو مباح الدم قرار دیتے تھے؟

iii۔ کیا سید احمد شہیدؒ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے قتل کو جائز سمجھتے تھے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، سید احمد شہیدؒ اور آپ کی تحریک پر قلمبند کی گئی تمام کتب کا مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ سید صاحبؒ فاسق وفاجر کلمہ گو مسلمانوں کو مسلمان ہی سمجھتے تھے نہ کہ کافر۔ سرحد کے خوانین کی سید صاحبؒ سے بے وفائی اور غداری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، جن کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ ''پشاور کے پٹھان امرا اگر وفاداری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔'' (سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول، ص 41)۔ ان پٹھان خوانین نے بارہا سید صاحبؒ کو دھوکہ دیا۔ بیعت کر کے بیعت توڑ دی جاتی، وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کرتے اور بالآخر انہی خوانین کی مسلسل بے وفائیوں کے نتیجے میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔ لیکن کیا تاریخی طور پر کوئی شخص یہ ثابت کر سکتا ہے کہ سید صاحبؒ یا آپ کے متعلقین نے اُن بے وفا اور غدار خوانین کی تکفیر کی ہو؟ حالانکہ حضرتؒ کے اکثر مریدین ومتعلقین ان پٹھان امرا کے منفی رویوں اور سوچ سے سید صاحبؒ کو آگاہ کرتے رہتے تھے اور ان خوانین پر اعتماد نہ کرنے کا کہا کرتے تھے۔ سلطان نجف علی خان جو کہ شہادت سے کچھ دن قبل سید صاحبؒ کے پاس آیا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا تو سید صاحبؒ نے اس کو معاف کر دیا۔ تو آپؒ کے مریدین نے کہا کہ یہ بے اعتماد آدمی

ہے، اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔ تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ دل کا حال اللہ کو معلوم ہے، ہم صرف ظاہر کے مکلّف ہیں۔ اگر سید صاحبؒ کی جگہ پاکستانی طالبان کا کوئی لیڈر مثلاً فضل اللہ عرف ریڈیو ہوتا تو ان تمام فاسق وفاجر خوانین پر کفر کے فتوؤں کی توپ چلائی جاتی۔ لیکن تاریخ تحریک شہدائے بالاکوٹ کا تمام لٹریچر اس بات کا گواہ ہے کہ سید صاحبؒ اور آپ کے متعلقین نے کبھی فساق وفجار مسلمانوں کی تکفیر نہیں کی۔

بالکل اسی طرح سید صاحبؒ عامۃ المسلمین کو مباح الدم نہیں قرار دیتے تھے۔ سید صاحبؒ یا آپ کے متعلقین نے کبھی بے گناہ انسانیت کا قتل نہیں کیا جس طرح آج پاکستانی طالبان بم دھماکوں اور خوش کش حملوں کے ذریعے بے گناہ انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگین کر رہے ہیں، اور نہ ہی سید صاحبؒ یا آپ کے متوسلین ومتعلقین نے کبھی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے قتل کو جائز سمجھا۔ تاریخ اس حوالے سے مکمل خاموش ہے اور سید صاحبؒ کی پاک دامنی ثابت کرتی ہے۔

آج جو لوگ پاکستانی طالبان کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تسلسل قرار دے رہے ہیں، انہوں نے کبھی سوچا ہے کہ آرمی پبلک سکول پشاور کا انسانیت سوز واقعہ، اور ماضی میں ہونے والے ملک کے طول وعرض میں دہشت گردی کے واقعات، جن میں سینکڑوں بے گناہ انسان قتل ہوئے، سید احمد شہیدؒ کی مقدس تحریک جہاد کا تسلسل ہیں؟ یہ ایک بہت بڑا تاریخی ظلم اور زیادتی ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو تحریک طالبان پاکستان کا فکری ہم نوا قرار دیا جائے۔

تاریخی حوالے سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سید احمد شہیدؒ نے کبھی اپنے مخالف خوانین سرحد کی تکفیر کی ہو، جہاد کے نام پر بے گناہ اور نہتے عوام الناس کا قتل عام کیا ہو یا بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کا قتل کیا ہو۔ اگر کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے۔ جبکہ طالبان کی جانب سے فاسق وفاجر کلمہ گو مسلمانوں کی تکفیر کی گئی ہے جس پر طالبان لٹریچر ''نوائے افغان جہاد'' ''حطین'' اور almawahideen.com ویب سائٹ پر موجود کتب گواہ ہیں جن میں مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں، سیکورٹی اداروں، پولیس، فوج اور سرکاری اداروں کے ملازمین کی تکفیر کی گئی ہے، آرمی پبلک سکول پشاور، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد اور ملک کے بیشتر پبلک مقامات پر طالبان کی جانب سے خودکش حملوں اور بم دھماکوں میں بے گناہ انسانیت کا قتل اور بچوں عورتوں کا قتل، پھر طالبان (پاکستانی) کی جانب سے ان واقعات کی ذمہ داری قبول کرنا، جس کے تمام ثبوت موجود ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ طالبان کی فکر اور سید احمد شہیدؒ کی فکر میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پاکستانی طالبان اور سید صاحبؒ کی فکر میں زمین وآسمان کا فرق ہے تو پھر تحریک طالبان پاکستان کو تحریک سید احمد شہیدؒ کا تسلسل قرار دینے کا دعویٰ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔

نوٹ:۔ ہم نے جو طالبان پر تنقید کی ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم افغان طالبان کے بھی مخالف ہیں بلکہ ہم افغان طالبان کے حامی اور پاکستانی طالبان کے مخالف ہیں۔

محمد یاسر اعوان
مدیر الشاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اکادمی، اٹک

فتویٰ کے نظام کے لیے قانون سازی کی ضرورت

اسلام آباد (عمر فاروق سے) حکومت نے مختلف مدارس اور دارالافتاؤں کی طرف سے جاری ہونے والے فتوؤں پر پابندی عائد کرنے اور مستند فتوؤں کے اجراء کے لیے قانون سازی کا فیصلہ کیا ہے۔ قانون سازی کے بعد وہی دارالافتاء فتویٰ دے سکیں گے جن کے پاس سرکاری لائسنس ہوگا۔ وزارت مذہبی امور نے اس حوالے سے مشاورت واقدامات شروع کر دیے ہیں۔ تفصیلات کے مطابق حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ گلی محلوں سے جاری ہونے والے فتوؤں پر پابندی عائد کی جائے اور ایسے مستند دارالافتاؤں کو فتویٰ دینے کے حوالے سے لائسنس دیا جائے جن کی عوامی اور دینی حلقوں میں کوئی حیثیت ہو۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ حکومت نے یہ فیصلہ نیشنل ایکشن پلان کی روشنی میں کیا ہے۔ حکومت کے مطابق ہر مسجد اور مدرسے سے جاری ہونے والے فتوے ملک میں خلفشار، انتشار اور فرقہ وارانہ تصادم کا سبب بن رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر گلی محلے میں دارالافتاء کھول دیے گئے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں فتوے اور مفتی کی حیثیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ بعض لوگ ایسے فتوے بھی دے رہے ہیں کہ جس سے ملکی سلامتی کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں اور بعض عناصر ریاست مخالف فتوے بھی دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے ریاست اور دفاعی اداروں کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بلاضرورت ہر بات پر بغیر تحقیق کے فتویٰ دے مارتے ہیں اور بعض لوگ سیاسی مفادات کے لیے فتوؤں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف دارالافتاؤں میں جو لوگ فتوے کے لیے تعینات کیے گئے ہیں ان کی علمی قابلیت بھی نہیں دیکھی جاتی اور نہ مفتیوں کے تقوے کو معیار بنایا جارہا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں مسلکی خلفشار بڑھ رہا ہے۔ اس لیے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کے جید علماء کرام کی مشاورت سے گلی محلوں کے دارالافتاؤں کو بند کر کے مستند دارالافتاؤں کو لائسنس جاری کیا جائے جو فتوے جاری کر سکیں۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ اس حوالے سے حکومت مختلف مسالک کے علماء کرام سے مشاورت کر رہی ہے اور ان کی طرف سے سامنے آنے والی تجاویز کی روشنی میں پارلیمنٹ میں قانون سازی کی جائے گی۔ اس حوالے سے وزارت مذہبی امور نے اس تاثر کو غلط قرار دیا ہے کہ حکومت فتوے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے، بلکہ حکومت چاہتی ہے کہ فتویٰ غیر سرکاری ہی رہے مگر مستند فتویٰ دیے جائیں تاکہ عوام میں فتوؤں کا معیار برقرار رہے۔ اس حوالے سے حکومت کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلامی تاریخ میں مفتیان کے فتوؤں کی بہت بڑی حیثیت اور قدر ہوتی تھی۔ ایک ایک فتوے سے حکومتیں ہل جاتی تھیں مگر ان فتوؤں میں کہیں بھی تعصب کی بو نہیں آتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فتوے کی حیثیت ختم ہوتی جارہی ہے، اس حیثیت کو بحال کرنے کے لیے حکومت ایسے اقدامات اٹھانا چاہتی ہے۔ اسی حوالے سے منگل کو وزارت امور مذہبی کے زیر اہتمام ہونے والے اجلاس میں جب کچھ علماء نے مختلف دارالافتاؤں کی طرف سے جاری ہونے والے فتوؤں کی نشاندہی کی تو وزیر مملکت برائے مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی پیر امین الحسنات نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فتاوٰی کے اجراء کے لیے جلد قانون سازی کی جائے گی اور ایسے معروف دارالافتاؤں کو لائسنس جاری کیا جائے گا جو مستند ہوں۔

(روزنامہ اوصاف لاہور۔ 14 اکتوبر 2015ء)